نظیر اکبر آبادی کی جمالیات

شکیل الرحمٰن

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

نظیر اکبر آبادی کی جمالیات

شکیل الرحمٰن

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔ا، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066

Nazir Akbarabadi Ki Jamaliyat
By : Shakeelur Rehman

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت : جولائی، ستمبر 2003 شک 1925
پہلا ایڈیشن : 1100
قیمت : 42/-
سلسلۂ مطبوعات : 1111

ISBN : 81-7587-025-7

ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی-110066
طابع : لاہوتی پرنٹ ایڈس، جامع مسجد، دہلی-110006

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے اُن اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدارسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب

ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کیں ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے اب ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا پروگرام شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہلِ علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ

ڈائرکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند، نئی دہلی

انتساب

اپنے چھوٹے بھائی

شعیب شمس کے نام

مجھے تو سمیٹ کر ایک کتاب میں بند کر دیا

خود کہاں چلے گئے بھائی؟؟

بابا سائیں

نظیر اکبر آبادی جشنِ زندگی (Celebrations of Life) کے ایک بڑے شاعر ہیں۔ ان کی جمالیات کے دائرے میں انسان، اس کی تمدنی اور تہذیبی زندگی، مناظرِ حسن و جمال، مظاہر کائنات، رقص حیات محبتوں کے نغمے، قہقہے، مختلف قسم کی خوبصورت آوازوں کا آہنگ سب شامل ہیں۔ شاعر نے پورے معاشرے کو گرفت میں لینے کی کوشش کی اور معاشرے کے جمالیاتی نقوش شاعری کی گرفت میں آ گئے۔

نظیر اکبر آبادی نے عوام کے مختلف طبقوں کی جمالیاتی تربیت میں حصہ لیا ہے شاعری اور عوام کی مادی اور روحانی زندگی میں گہرا رشتہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اس طرح ان کی جمالیات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا ہے انہوں نے ماضی کے جمال اور اسطور کے حسن کو بھی عزیز رکھا ہے غزلیں اور نظمیں لکھیں، قصیدے لکھے مثنویاں اور رباعیاں لکھیں، مسدس اور ترجیع بند کے علاوہ فارسی شاعری سے بھی اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ فارسی میں بھی غزلیں کہیں حافظ سعدی اور امیر خسرو کی غزلوں پر ان کا ہر خمسہ توجہ کا مرکز ہے۔ مشاہدوں کا اتنا بڑا شاعر اردو ادب میں پیدا نہیں ہوا، مشاہدہ کرتے ہوئے جزئیات پر بڑی گہری نظر ملتی ہے، نظیر نے جتنے الفاظ گھڑے ہیں اس کی مثال نہیں ملے گی۔ ایک طرف فارسی اور اردو تہذیب کے روایتی الفاظ ملتے ہیں اور دوسری طرف کھڑی اور برج بھاشا کے سیکڑوں الفاظ ملتے ہیں۔ انہوں نے ڈکشن کا

ایک بہت بڑا سرمایہ چھوڑا ہے اور یہ اردو زبان وادب کے لیے ایک بڑی نعمت ہے۔ نظیر اس طرح ایک ادبی روایت بھی بن جاتے ہیں ایسی روایت کہ جس سے محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی بھی ایک گہرا رشتہ رکھتے ہیں، ان کے بعد میر انیس، جوش ملیح آبادی اور احسان دانش وغیرہ تک ان کے ڈکشن اور انداز بیان کی پہچان ہوتی ہے۔ محمد حسین آزاد جو خود نظیر کے ڈکشن اور اسلوب سے متاثر ہیں آب حیات میں اس شاعر کو اپنے اصولوں کے پیش نظر ،نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ولی کے حالات کے ذکر میں ''اصولوں'' کے پیش نظر نظیر اکبرآبادی کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

''نظیر کے بعض اشعار ایسے ہیں کہ میؔر سے پہلو مارتے ہیں۔ پس اگر نظیر کا ذکر لکھ کر اس کے چند شعر منتخب لکھ دیئے جائیں تو ناواقف سوائے اس کے کہ نظیر کو میؔر کا ہم پلہ شاعر سمجھے اور کیا تصور کر سکتا ہے'' (آبِ حیات)

یہ قبول کرتے ہیں کہ نظیر کے بعض اشعار میر سے پہلو مارتے ہیں لیکن انھیں اہمیت دینا نہیں چاہتے، حالانکہ ان کا بنیادی اصول یہ ہے کہ منتخب کلام پیش کر دیا جائے اور خوبیاں بتائی جائیں۔ وہ نظیر کے تغزل کا ذکر تو کر ہی سکتے تھے، حیرت ہے تذکرہ نگاروں کو جو خامیاں نظیر کے کلام میں نظر آئیں وہ میر، سودا، مصحفی، میر حسن وغیرہ کے کلام میں بھی موجود ہیں اس کے باوجود انہوں نے نظیر اکبرآبادی کے کلام کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مناسب تصور نہیں کیا۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور مولانا شبلی نے بھی کلام نظیر کے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے۔

اردو ادب میں جشن زندگی کے اس بڑے شاعر کے مزاج اور رجحان کی پہچان مندرجہ ذیل نظموں سے ہو جاتی ہے۔

بہار، چاندنی، برسات کا تماشا، برسات کی بہاریں، جاڑے کی بہاریں، شب برأت، عید، عید الفطر، بسنت، ہولی، (کم وبیش دس نظمیں) دیوالی، راکھی، بلدیو

جی کا میلا، کبوتر بازی۔ نظیر زندگی کے تحرک اور حسن و جمال پر عاشق ہیں، وہ ہر لمحہ کو غنیمت جانتے ہیں اس بات کا احساس ہے کہ زندگی مختصر ہے لہٰذا وہ چاہتے ہیں کہ جشنِ زندگی کو سمجھا جائے اور اس کی قدر کی جائے، یہ جشن موسموں کا ہو یا تمدنی اور تہذیبی زندگی کا۔ قدرت کا جشن مسلسل جاری رہتا ہے اس سے لطف اندوز ہوتے رہو، ہنستے مسکراتے رہو اس لیے کہ محبتوں اور زندگی کے جمال کے دن تھوڑے ہیں اس دنیا سے گزر جانا ہے۔ ان کی ایک پیاری سی نظم ہے "حسن و جمال کو غنیمت جانو" اس سے شاعر کے درد کے رشتے کی فوراً پہچان ہو جاتی ہے، ان کا کہنا یہی ہے۔

مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے
حسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے

اس نظم کے چند بند پیش کرتا ہوں۔

اپنے غم خواروں سے کوئی آن ہنس لے بول لے — درد مندوں کا نکال ارمان ہنس لے بول لے
پھر کہاں یہ دل بڑی یہ شان ہنس لے بول لے — دم غنیمت ہے ارے نادان ہنس لے بول لے

مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے
حسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے

آج تجھ کو حق نے دی ہے حسن وخوبی کی بہار — چاہنے والوں سے کر لے کچھ سلوک و مہر و پیار
کوندنا بجلی کا اور جو بن کا مت گن اعتبار — کاٹھ کی ہانڈی نہیں چڑھتی ہے پیارے بار بار

مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے
حسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے

اب تو منہ گل ہے پیارے پھر دھتورا آکھ ہے — آج یہ گلشن کھلا ہے کل کو سوکھ ساکھ ہے
جو اٹھا شعلہ بھبو کا آخرش کو راکھ ہے — چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیرا پاکھ ہے

مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے

حسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے

حسن کا عالم ستم گر ہر گھڑی ملتا نہیں　　گل بھی کھل اک باری اے جاں پھر کبھی کھلتا نہیں

مجھ سے تیرا روٹھنا ہر دم کا اب جھلتا نہیں　　دودھ اور دل جب پھٹا پیارے یہ پھر ملتا نہیں

مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے

حسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے

اپنے اپنے وقت میں کیا کیا پری رو بن رہے　　چاند سے مکھڑے رہے اور گل سے ان کے تن رہے

نہ کسی کا دھن رہے اور نہ سدا جوبن رہے　　نہ سدا پھولے ترئی اور نہ سدا ساون رہے

مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے

حسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے

اب نظیر آگے ترے رہتا ہے حاضر صبح شام　　پیار سے ہنس بول پیارے پی لے الفت کا جام

پھر کہاں یہ دل بری یہ عیش کی باتیں مدام　　کچھ نہ ہوئے گا رہے گا، آخرش اللہ کا نام

مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے

حسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے

محبوب سے مخاطب ہو کر وقت اور لمحوں کے حسن کا احساس طرح طرح سے دیا ہے بار بار کہتے رہے ہیں کہ وقت رکنے ٹھہرنے والا نہیں ہے یہ تیزی سے گزرتا جارہا ہے اور پھر گزر جائے گا، حسن گم ہو جائے گا، یہ جو حسن ہے وہ صرف دو دن کا ہے لہٰذا جشن زندگی میں اپنے پورے وجود کو لئے اور اپنی تمام توانائیوں کے ساتھ شریک ہو جاؤ لمحوں سے لطف اندوز ہو کر جمالیاتی مسرت اور شادمانی حاصل کرو۔ محبوب کو سوچنا چاہئے کہ اس کا جمال ہمیشہ قائم نہیں رہے گا ایسا کوئی حسن والا نہیں ہے کہ جس کی خوبی کا ہمیشہ ایک سا عالم رہا ہو۔

کیوں خفا ہوتا ہے ہم سے یاد رکھ اے دل ربا

ہاتھ آتا ہے نہیں کافر یہ جب جوبن گیا

نظیر زندگی کے جشن میں شریک ہیں اس جشن میں شریک ہونے کی دعوت دیتے رہتے ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ زندگی مختصر ہے زندگی سے مایوس نہیں ہوتے۔ اچھے ادب کی ایک بڑی پہچان یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کی جمالیاتی تشریح اس طرح کرتا ہے کہ قاری زندگی کے تضاد اور انتشار کو سمجھتے اور تضاد اور انتشار کے تجربوں کو حاصل کرتے رہنے کے باوجود فنکار کے پیش کئے ہوئے تجربوں سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے اور جمالیاتی آسودگی اور جمالیاتی انبساط پاتا رہتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی سات رنگوں کے شاعر ہیں انہوں نے ایک قوس قزح کھینچ کر رکھ دی ہے، یہ تمام رنگ ایک دوسرے میں جذب ہیں اور ایک وحدت کا تاثر دیتے ہیں۔

ایک رنگ زندگی کے جلال و جمال کا پختہ رنگ ہے، فطرت کی تصویروں اور ان کے آہنگ کا احساس ہے جو اس رنگ کو اور پختہ کرتا ہے۔ بہار، چاندنی، برسات اور آندھی جیسی نظمیں اس رنگ کی نمائندگی کرتی ہیں۔

دوسرا رنگ عشق و محبت کے جمال کا رنگ ہے، سوز فراق، طلسم وصال، ملاقاتِ یار، جوش جنوں، خواب کا طلسم وغیرہ اس خاص رنگ کو نمایاں کرتی ہیں۔

تیسرا رنگ معاشرے اور سماج کے جمال کا وہ رنگ ہے جو روایات سے گہرا رشتہ رکھتے ہوئے ہولی کے گلال کے مختلف رنگوں کی طرح بکھرتا رہتا ہے بانسری، شب برات، بسنت، ہولی، دیوالی، راکھی اس رنگ کی نمائندگی کرتی ہیں۔

چوتھا رنگ مذہب اور تصوف کا دلکش اور پرکشش رنگ ہے۔ حمد، نعت، منقبت، مدح اولیا، فقیروں کی صدا، بنجارہ نامہ، رہے نام اللہ کا، توحید، تسلیم و رضا، زندگی اور موت، توکل، فنا، وجود حال، کلجگ، اور چڑیوں کی تسبیح وغیرہ اس رنگ کی نمائندہ

نظمیں ہیں۔

پانچواں رنگ ان نظموں میں نمایاں ہے کہ جن میں وقت اور لمحوں کو عمر کے مدارج کے پیش نظر پیش کیا گیا ہے مثلاً طفلی، جوانی، بڑھاپا، موت کا دھڑکا وغیرہ۔

چھٹا رنگ دیومالا اور روایتی کہانیوں سے ابھرتا ہے۔ جنم کنہیا جی، درگا جی کے درشن، تعریف بھیروں کی، مہادیو جی کا بیاہ، کنہیا جی کی راس اس رس یا رنگ کی نمائندہ نظمیں ہیں۔

ساتویں رنگ کی پہچان 'حکایات' میں ہوتی ہے۔ قصہ ہنس، کوّے اور ہرن کی دوستی، قصہ لیلیٰ مجنوں وغیرہ اس رنگ کی عمدہ نظمیں ہیں۔

سات رنگوں کی وحدت کا یہ شاعر اردو ادب میں اپنا ایک بلند ممتاز مقام رکھتا ہے۔ یہ سات سُر ہیں جو مختلف آہنگ رکھتے ہیں اور قاری کے جمالیاتی شعور کو متاثر کرتے رہتے ہیں قاری کو ایک جمالیاتی وژن عطا کر کے جشنِ زندگی کی جانب بند دریچے کو کھول دیتے ہیں۔

نظیر اکبرآبادی حسن پسند ہیں لیکن یہ سچائی خوب جانتے ہیں کہ یہ جشنِ زندگی، یہ دنیا کے تماشے، اشیاء وعناصر کا یہ رقص، فطرت یا نیچر کی یہ میلوڈی، یہ حسین اور خوبصورت صورتیں یہ سب گم ہو جائیں گے۔ ان کا جمالیاتی شعور بار بار اصرار کرتا ہے آنکھیں کھول، یہ تماشا دیکھ لے، رقصِ زندگی سے لطف اندوز ہو، بھولی بھالی پیاری پیاری صورتوں اور چاند سے مکھڑوں کو جی بھر کر دیکھ لے اور جمالیاتی آسودگی اور انبساط حاصل کر گلشن زندگی کی خوب خوب سیر کر لے بلبلوں کی چہک اور باغوں کے البیلے پھولوں کی خوشبوؤں کو اپنے وجود کے اندر اتار لے اس لیے کہ پھر یہ تماشے دیکھنے کو نہیں ملنے والے۔ دنیا کے تماشے، ان کی ایک بہت ہی دلکش نظم ہے جس میں بار بار یہ کہتے ہیں۔

دیکھ لے دنیا کو غافل یہ تماشے پھر کہاں!

اس نظم کے چند بند ملاحظہ فرمایئے۔

کھول ٹک چشم تماشا، یار باشے پھر کہاں　　　یہ شکار وصید، یہ شکرے وباشے پھر کہاں
مال ودولت، سونا روپا، تولے ماشے پھر کہاں　　　دم غنیمت ہے، بھلا یہ بود باشے پھر کہاں

دیکھ لے دنیا کو غافل، یہ تماشے پھر کہاں

دل لگا الفت میں اور کرلے پری زادوں کی چاہ　　　چاند مکھڑوں سے مل، سورج وشعوں پر کر نگاہ
کچھ مزے، کچھ لوٹ حظ، یہ وقت کب ملتا ہے آہ!　　　کھالے، پی لے سکھ دے اور دے لے دلا دے واہ واہ

دیکھ لے دنیا کو غافل، یہ تماشے پھر کہاں

حسن والوں کے بھی کیا کیا حسن کے عالم ہیں یاں　　　سانولے، گورے، سنہری، سرخ باندھے پگڑیاں
کیا سجیں کیا کیا دھجیں کیا ناز کیا چھب تختیاں　　　بھولی بھولی صورتیں اور پیاری پیاری انکھڑیاں

دیکھ لے دنیا کو غافل، یہ تماشے پھر کہاں

صبح ہو تو سیر کر، باغوں کی جاکر با فراغ　　　بلبلیں چہکیں ہیں اور گل لعل دیتے ہیں مثال باغ
شام ہو تو روشنی کو دیکھ، پی لے کے ایاغ　　　جل رہے ہیں جھاڑ و مشعل شمع قندیل وچراغ

دیکھ لے دنیا کو غافل، یہ تماشے پھر کہاں

کتنے مے خانوں کے در پر لوٹتے ہیں پی کے مے　　　کتنے مجلس کر کے سنتے ہیں دف ومردنگ ونے
دیروں میں اور مسجدوں میں کرتے ہیں غل پے بہ پے　　　ہر طرف دھومیں مچیں ہیں دید ہے اور سیر ہے

دیکھ لے دنیا کو غافل، یہ تماشے پھر کہاں

دھرتی پر زندگی کے حسن وجمال سے محبت کی دو بڑی مثالیں اردو ادب میں ملتی ہیں ایک محبت نظیر اکبر آبادی کی اور دوسری مرزا غالب کی۔ اسے دھرتی پر محبت کا عظیم رشتہ یا The Greatest Love Affair on Earth کہا جاسکتا ہے۔ جشنِ زندگی کے تعلق سے نظیر کے جتنے جمالیاتی تجربے ہیں ان کے پیچھے انسان اور

جمالِ زندگی اور جمالِ فطرت سے درد کے ایک گہرے رشتے کے احساس کے ساتھ ان کے ختم ہوجانے اور گم ہوجانے کا درد موجود ہے۔ خوشی مناتے ہوئے وہ خوشی بسنت کی ہو یا عید کی، ہولی کی ہو یا شب برأت کی شاعر کے اس درد کا آہنگ موجود ہے۔ ان کی نظم ''فنائے جہاں وبقائے رحماں'' اس درد اور اس درد کے آہنگ کے تئیں بیدار کردیتی ہے، نظیر اکبرآبادی فنائے جہاں، کو مختلف انداز سے سمجھا دیتے ہیں ان کی میلوڈی کا آہنگ تبدیل ہوجاتا ہے۔ کہتے ہیں۔

یہ چرخ جو کھاتا ہے پڑا گنبد ازرق — یہ چاند، یہ سورج، یہ ستارے ہیں معلق
لوح وقلم وعرش بریں، ثابت ومطلق — سب ٹھاٹھ یہ اک آن میں ہوجاوے گا ہوحق

آغاز کسی شئے کا نہ انجام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

لے عالم ارواح سے تا عالم جناتِ — انسان، پری، حور وملک، جن وحیثات
کیا ابر ہوا، جنگل وکوہ ارض وسموات — اک پھونک میں اڑ جائیں گے جوں نقش طلسمات

ہشیار، نہ پختہ، نہ کوئی خام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

یہ باغ وچمن اب جو ہر اک جا میں رہے پھول — شاخ، یہ غنچہ، یہ ہرے پات، یہ پھل پھول
آجاوے گی جب بادِ خزاں ان کے ابر پھول — ہر خار کی، پھر پھول کی اُڑ جاوے گی سب دھول

نے زرد، نہ سرخ اور نہ سیہ فام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

ٹک غور کرو اب ہیں کہاں مجنوں وفرہاد — لیلیٰ کہاں شیریں کہاں وہ ناز وہ بے داد
جو پھول کھلے، واہ، وہ سب ہوگئے برباد — ہم تم بھی غنیمت ہیں سن، او یار پری زاد

واں حسن، نہ یاں عشق کا ہنگام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

محبوب بنا جس نے تمہیں حسن دیا ہے — اس نے ہی ہمیں عاشق جانباز کیا ہے
ملنا ہے تو مل لو، یہی جینے کا مزا ہے — سب نازو نیاز ،آہ یہ اک دم کی ہوا ہے

پھر ہجر، نہ کچھ وصل کا پیغام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

اردو شاعری میں صرف کبیر (جنہیں میں اردو کا پہلا بڑا شاعر سمجھتا ہوں) اور نظیر ایسے شعراء ہیں جو سنجیدہ اور تلخ سچائیوں میں لوک گیتوں کا ذائقہ پیدا کر کے بچوں جیسے معصومانہ انداز (Child Like Innocence) کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں، نظیر کے کلام کو پڑھتے ہوئے اکثر محسوس ہوتا ہے کہ ان میں بچوں جیسی معصومیت ہے بچوں جیسا بھولپن ہے غالباً یہی وجہ ہے کہ نظمیں قاری کی سائیکی، پر فوراً اثر انداز ہوتی ہیں اسی بھولے پن اور معصومیت کا کرشمہ ہے کہ ان کی نظموں میں دلفریب سحر انگیزی (Magical Charm) حسن و جمال کی دلکشی، دل آویزی اور دلفریبی پیدا ہوئی ہے، یہ معصومیت حسن کے مظاہر اور زندگی کے جشن کے مختلف مناظر کو اسی طرح دیکھتی ہے کہ جس طرح کوئی معصوم بچہ ٹکٹکی باندھ کر کھیل تماشوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔لیکن ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جمالیاتی اور تہذیبی قدروں کے تئیں بیدار شاعر کی سرشاری اور Playfulness باتوں باتوں میں بڑی باتوں کی جانب اشارے بھی کر دیتی ہے۔یہ دلفریب سحر انگیزی نظیر اکبر آبادی کے آرٹ کی سب سے بڑی جمالیاتی قدر ہے۔

جشنِ زندگی کے مختلف مناظر اور کھیل تماشوں کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

پھر آن کے عشرت کا مچا ڈھنگ زمیں پر اور عیش نے عرصہ ہے کیا تنگ زمیں پر
ہر دل کو خوشی کا ہوا آہنگ زمیں پر ہوتا ہے کہیں راگ کہیں رنگ زمیں پر
بجتے ہیں کہیں تال کہیں زنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

گھنگرو کی پڑی آن کے پھر کان میں جھنکار سارنگی بھی ہوتی ہیں طنبوروں کی مددگار
طبلوں کے ٹھکے طبل پہ سازوں کے بجے تار راگوں کے کہیں غل کہیں ناچوں کے بندھے تار
ڈھولک کہیں جھنکارے ہے مردنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

اس رات چمن پر بھی عجب رنگ چڑھا ہے اور جنگل و بن پر بھی عجب رنگ چڑھا ہے
ہر شوخ کے تن پر بھی عجب رنگ چڑھا ہے عاشق کے بدن پر بھی عجب رنگ چڑھا ہے
سب عیش کے رنگوں میں ہے ہم رنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

"گاگا" کے پکاریں کہیں رنگوں کی چھڑک ہے مینائی بھبک اور کہیں ساغر کی جھلک ہے
طبلوں کی صدائیں کہیں تالوں کی جھنک ہے تالی کی بہاریں کہیں ٹھلیا کی کھڑک ہے
بجتا ہے کہیں دف کہیں مر چنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

معمور ہیں خوباں سے گلی کوچہ و بازار اڑتا ہے عبیر اور کہیں پچکاری کی ہے مار
چھایا ہے گلالوں کا ہر اک جا پہ دھواں دھار پڑتی ہے جدھر دیکھو ادھر رنگ کی بوچھار
ہے رنگ چھڑکنے سے ہر اک دنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

بھاگے ہے کہیں رنگ کسی پر جو کوئی ڈال　　　وہ پوٹلی مارے ہے اسے دوڑ کے فی الحال
یہ ٹانگ گھسیٹے تو وہ کھینچے ہے پکڑ بال　　　وہ ہاتھ مروڑے تو یہ توڑے ہے کھڑا گال
اس ڈھب کے ہر اک جا پہ مچے ڈھنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

(ہولی)

●

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
ساغرے کے چھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
محبوب نشے میں جھکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

ہو ناچ رنگیلی پریوں کا بیٹھے ہوں گل رو رنگ بھرے
کچھ بھیگے تانیں ہولی کے کچھ ناز و ادا کے ڈھنگ بھرے
دل بھولے دیکھ بہاروں کو اور کانوں میں آہنگ بھرے
کچھ طبلے کھڑکیں رنگ بھرے کچھ عیش کے دم منہ جنگ بھرے
کچھ گھنگھرو وتال جھنکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

گلزار کھلے ہوں پریوں کے اور مجلس کی طیاری ہو
کپڑوں پر رنگ کے چھینٹوں سے خوش رنگ عجب گل کاری ہو
منھ لال، گلال آنکھیں ہوں اور ہاتھوں میں پچکاری ہو
اس رنگ بھری پچکاری کو انگیا پر تک ماری ہو

سینوں سے رنگ ڈھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

(ہولی)

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاہٹ، باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاہٹ قطرات کی بہاریں
ہر بات کے تماشے، ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بادل ہوا کے اوپر ہو مست چھا رہے ہیں
جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہرجا، جل تھل بنا رہے ہیں
گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جنگل سب اپنے تن پر، ہریالی سج رہے ہیں
گل پھول جھاڑ بوٹے کراپنی دھج رہے ہیں
بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہے ہیں
اللہ کے نقارے، نوبت کے بج رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہر جا بچھا رہا ہے سبزا ہرے بچھونے
قدرت کے بچھ رہے ہیں ہر جا ہرے بچھونے
جنگلوں میں ہورہے ہیں پیدا ہرے بچھونے
بچھوا دیئے ہیں حق نے کیا کیا ہرے بچھونے

کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

سبزوں کی لہلہاہٹ کچھ ابر کی سیاہی
اور چھا رہی گھٹائیں سرخ اور سفید کاہی
سب بھیگتے ہیں گھر گھر، لے ماہ تابہ ماہی
یہ رنگ کون رنگے، تیرے سوا الٰہی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کیا کیا رکھے ہے یا رب، سامان تیری قدرت
بدلے ہے رنگ کیا کیا، ہر آن تیری قدرت
سب مست ہو رہے ہیں پہچان تیری قدرت
تیتر پکارتے ہیں سبحان تیری قدرت

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئل کی کوک میں بھی تیرا ہی نام ہوگا
اور مور کی زٹل میں تیرا پیام ہوگا
یہ رنگ سو بڑے کا جو صبح وشام ہوگا
یہ اور کا نہیں ہے تیرا ہی کرم ہوگا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بولیں ہے بٹیریں، قمری پکارے کو کو
پی پی کرے پپیہا بگلے پکاریں تو تو
کیا ہد ہدوں کی حق حق، کیا فاختوں کی ہو ہو
سب رٹ رہے ہیں تجھ کو کیا پنکھ کیا پکھیرو

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو مست ہوں ادھر کے کرشور ناچتے ہیں
پیارے کا نام لے کر کیا زور ناچے ہیں
بادل ہوا سے گر گر، گھنگھور، ناچتے ہیں
مینڈک اچھل رہے ہیں اور مور ناچتے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں
(برسات کی بہاریں)

میں نے کہا ہے کہ لوک گیتوں کا ذائقہ پیدا کرتے اور بچوں جیسے معصومانہ انداز پیدا کرتے ہوئے شاعر کی سرشاری اور Playfulness باتوں باتوں میں تلخ سچائیوں کو بھی پیش کر دیتی ہے، اسی نظم میں مندرجہ ذیل بندوں پر نظر ڈالئے۔

جو خوش ہیں وہ خوشی میں کاٹے ہیں رات ساری
جو غم میں ہیں انہیں پر گزرے ہے رات بھاری
سینوں سے لگ رہی ہیں، جو ہیں پیا کی پیاری
چھاتی پھٹے ہے ان کی جو ہیں برہ کی ماری
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں
جو وصل میں ہیں ان کے جوڑے مہک رہے ہیں
جھولوں میں جھولتے ہیں گہنے چمک رہے ہیں
جو دکھ میں ہیں سو ان کے سینے بھڑک رہے ہیں
آہیں نکل رہی ہیں آنسو ٹپک رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

اب برہنوں کے اوپر ہے سخت بے قراری
ہر بوند مارتی ہے سینے اپر کٹاری
بدلی کی دیکھ صورت، کہتی ہیں باری باری
ہے ہے نہ لی پیا نے اب کے بھی سدھ ہماری
کیا کیا مچی ہیں، یارو برسات کی بہاریں

جب کوئل اپنی ان کو آواز ہے سناتی
سنتے ہی غم کے مارے چھاتی ہے امڈی جاتی
پی پی کی دھن کو سن کر بے کل ہیں کہتی جاتی
مت بول اے پپیہے پھٹتی ہے میری چھاتی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہے جن کی سیج سونی اور خالی چارپائی
رو رو انہوں نے ہر دم، یہ بات ہے سنائی
پردیسی نے ہماری اب کے بھی سدھ بھلائی
اب کے بھی چھاونی جا، پردیس ہی میں چھائی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنوں نے اپنی غم سے اب ہے یہ گت بنائی
میلے کچیلے کپڑے، آنکھیں بھی ڈبڈبائی
نے گھر میں جھولا ڈالا، نے اوڑھنی رنگائی
پھوٹا پڑا ہے چولہا، ٹوٹی پڑی کڑھائی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جشن زندگی کی میلوڈی (Melody) میں حزنیہ آہنگ شامل ہو جاتا ہے،

جوش، رقص اور تحرک کیساتھ المیہ مناظر بھی قاری کی سائیکی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

نظیر اکبر آبادی کی نظر اپنے کلچر کے نفسی رجحانات (Psychic Attitudes) پر بڑی گہری ہے۔ سماجی اور روحانی رجحانات کو سمجھتے ہوئے عوام کی سائیکی تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ موضوع منتخب کرتے ہیں تو اپنے تیز مشاہدے سے کام لیتے ہوئے جزئیات کی پیشکش کو اپنے فن کی ایک بڑی خصوصیت بنا دیتے ہیں۔ ہیومنزم ان کی شاعری کی روح ہے جو ہر دم روشن رہتی ہے، اسی روشن چراغ کو ہاتھ میں لئے وہ انسان کو موضوع بناتے ہیں کسی بھی موضوع پر اظہار خیال کر رہے ہوں بنیادی موضوع انسان ہی ہوتا ہے اسی کی محبت ہوتی ہے، آواز اذان کی ہو یا ناقوس کی وہ قلندر کی طرح جھومنے لگتے ہیں۔ لفظوں کے بادشاہ ہیں ان کے خزانے میں لفظوں کی کمی نہیں ہے، تجربوں میں جو بے ساختگی اور بہار ہے وہ لفظوں اور ان کے آہنگ کی وجہ سے ہے، لفظوں سے جو آوازیں پیدا ہوتی ہیں وہ غیر معمولی حیثیت رکھتی ہیں، لفظوں اور ان کے آہنگ سے نظم کی معنوی کیفیت مجسم ہو جاتی ہے، نظیر اکبر آبادی ایک منفرد، میلوڈی، کے خالق ہیں، یہ ''میلوڈی'' قاری کو ہر جانب سے گھیر لیتی ہے اور اپنے خاص آہنگ سے تازگی عطا کرتی ہے، توانائی دیتی ہے اور رقصِ زندگی میں شامل ہونے کے لیے اکساتی ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار پر نظر ڈالئے:

ہر طرف گل بدن رنگیلے ہیں   تک پلک غنچہ لب سجیلے ہیں
بات کے ترچھے اور کٹیلے ہیں   دل کے لینے کو سب ہٹیلے ہیں
خشک تر نرم سوکھے گیلے ہیں   ٹیڑھے بل دار اور نکیلے ہیں
جوڑے بھی سرخ سبز پیلے ہیں   پیار الفت، بہانے حیلے ہیں

●

نازنیں ہیں وہ سانوری گوری　　جن کی نازک ہر اک پری پوری
کر کے چتون نگاہ کی ڈوری　　دل کو چھینے ہیں سب زورا زوری
دھوم، ناز و ادا جھکا جھوری　　برج میں جیسے بج رہی ہوری
گھونگھٹوں میں ہیں کررہی چوری　　چوری کیسی کہ صاف سرزوری

●

ناچ اور راگ کے کھڑا کے ہیں　　گھنگرو اور تال کے جھنا کے ہیں
نقلیں، قصے، کہانی ساکے ہیں　　کھنڈ، دوہرے کبت کتھا کے ہیں
کہیں آغوش کے لپاکے ہیں　　کہیں بوسوں کے سوچھپا کے ہیں
تھر تھری دانت پر کڑاکے ہیں　　تس پہ جاڑے کے سوجھڑا کے ہیں

●

کوئی چنچل چلے ہے ٹھسکی چال　　کچھ وہ پتلی کمر وہ لمبے بال
آنکھوں میں حسن کے نشے رنگ لال　　مصری ماکھن کے ہاتھوں اوپر تھال
کچھ وہ پوشاک کچھ وہ حسن وجمال　　مانسوں کا زیادہ ان سے کمال
ڈال دیں ہار کا گلے میں جال　　بدھی ہوکر لیں صاف دل کو نکال

●

ایسی جانے اور کتنی مثالیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظیر اکبرآبادی کو زبان پر کتنا عبور حاصل ہے۔ اس شاعری کا رشتہ کلچر سے مربوط اور مستحکم ہے۔ پڑھے لکھے لوگ ہوں یا ان پڑھ سب اس شاعری کے دلدادہ رہے ہیں۔ لفظوں کے انتخاب میں سنجیدگی بھی ہے الھڑ پن بھی ہے، سادگی بھی ہے اور تازگی بھی ہے۔ طربیہ اور المیہ دونوں کے لئے کلام نظیر میں جانے کتنے آہنگ اور متحرک کیفیات ہیں۔ نظیر کا وژن ایک مصور کا وژن ہے تصویر کاری کی خوبصورت تکنیک کے لیے مناسب لفظوں کا

فنکارانہ استعمال ملتا ہے۔ ڈکشن، (Diction) میں عام فہم اور مروج الفاظ کے ساتھ نئے الفاظ بھی ملتے ہیں جو نظیر کے خود گڑھے ہوئے ہیں۔ لفظوں کی پرانی صورتوں کو نئی صورتیں دیتے رہنے کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ ڈکشن کی ان کی اپنی دنیا ہے جن میں الفاظ اپنی معنویت کو لئے اکثر کرداروں کی طرح عمل کرتے نظر آتے ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے نظیر نے اپنی روایتوں کا 'رس' خوب پیا ہے جس سے انہیں وہ اردو حاصل ہوئی ہے کہ جس میں برج، کھڑی اور دوسری کئی، مقامی بولیوں کے الفاظ موجود ہیں اور اس زبان کا اپنا منفرد حسن ہے، نظیر کے ڈکشن اور اسلوب کا اپنا اعلیٰ معیار ہے اس معیار تک اردو کا کوئی شاعر نہیں آیا۔ جو اشعار پیش کئے گئے ہیں ان سے ایک مصور شاعر کی تصویر ابھرتی ہے، ایک ایسے تخلیقی مصور شاعر کی تصویر جو جزئیات پر گہری نظر رکھتا ہے۔ ایک کے بعد دوسری تصویر ابھرتی ہے اور جزئیات کے فن سے متاثر کرتی ہے۔ نظیر اکبرآبادی کے ان اشعار میں سانوری اور گوری نازنینوں کی ادائیں متحرک ہیں اس حد تک کہ اپنی نگاہ کی ڈوری سے دل چھینتی نظر آتی ہیں، ان کی گل بدنی قابلِ دید ہے، گھونگھٹ نکالے نازنین چپکے چپکے چوری کرتی نظر آرہی ہیں، ایک تصویر سانوری اور گوری چنچل نازنینوں کی سامنے آتی ہے تو دوسری تصویر رقص وحرکت کی، ''ناچ اور راگ کے کھڑا کے ہیں گھنگرو اور تال کے جھناکے ہیں'' آہنگ اور حرکت سے یہ تصویر اور جان پرور بن گئی ہے۔ تیسری تصویر میں ایک چنچل دوشیزہ جس کی ٹھمکی چال قابلِ دید ہے، کمر پتلی ہے بال لمبے ہیں آنکھوں میں حسن کا نشہ ہے، تھال میں مصری ماکھن سنبھالے چل رہی ہے، کسی کے گلے میں ہار کا جال ڈال دے تو بڑی صفائی سے دل نکال لے۔

ڈال دیں ہار کا گلے میں جال
بدھی ہوکر لیں صاف دل کو نکال

اردو کے اس ممتاز شاعر کے ساتھ تذکرہ نویسوں اور نقادوں نے جو سلوک کیا ہے اسے دیکھ کر دکھ اس لیے بھی ہوتا ہے کہ ہم خود اپنا نقصان کرتے آئے ہیں، نظیر کی پہچان نہ ہو سکی جشنِ زندگی کی اس شاعری کو ہم سمجھ نہ سکے اردو شاعری کی جانی پہچانی روایات اور ان روایات کے تسلسل ہی کو اہم تصور کیا، جن نظموں کے پیچھے ایک دانشور چھپا بیٹھا تھا جو سچائیوں میں حسن و جمال کی روشنی جذب کر رہا تھا جو افسانویت، تمثیلیت اور ڈرامائیت کو اپنائے بیٹھا تھا اور جو شاعری میں مصوری اور تصویر کاری کے جلوؤں کو لئے ہوئے تھا جو مقامی بولیوں اور برج اور کھڑی کے لفظوں اور ترکیبوں سے اردو زبان کو مالا مال کر رہا تھا اسے نظر انداز ہی نہیں کیا بلکہ اس پر الزامات بھی عاید کئے مثلاً وہ محاورے کے خلاف الفاظ استعمال کرتا ہے اضافتوں کا استعمال زیادہ کرتا ہے، اس کی شاعری میں فحش باتیں ہیں، اکثر حرف ساکن کو متحرک کر دیتا ہے اور ساکن کو متحرک وغیرہ وغیرہ۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ فرماتے ہیں۔

"اشعار بسیار دارد کہ برزبانِ سوقین جاری است ونظر بہ آن ابیات دراعداءِ شعرانہ بایدش شمرد، لفا برعایتِ اشعارِ منتخب قطع نظر کردہ شد"

(گلشن بے خار)

یعنی نظیر اکبر آبادی کے بیشتر اشعار سوقیوں کی زبان پر جاری ہیں اور ان اشعار پر نظر رکھتے ہوئے اسے شعراء کی صف میں شمار نہیں کرنا چاہئے! غور فرمایئے یہ کیسی تنگ نظری اور کیسا تعصب ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی کہتے ہیں نظیر کی زبان اہل زبان کم جانتے ہیں۔ لکھا ہے۔

"نظیر اکبر آبادی نے شاید میر انیس سے زیادہ الفاظ استعمال کئے ہیں مگر ان کی زبان کو اہل زبان کم جانتے ہیں"

مولانا یہ نہیں بتاتے کہ نظیر کے الفاظ اور مجموعی طور پر ان کی زبان کوئی اہمیت رکھتی بھی ہے یا نہیں۔ محمد حسین آزاد کے خیال کا ذکر کر چکا ہوں۔ وہ 'ناواقف' لوگوں سے نظیر کو میر سے اور میر کو نظیر سے بچائے رکھنا چاہتے ہیں وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ نظیر، میر تقی میر کا ہم پلہ شاعر ہے۔ انہوں نے اس بات کا اقرار تو کیا ہے کہ نظیر کے بعض اشعار ایسے ہیں کہ میؔر سے پہلو مارتے ہیں لیکن ''ناواقف لوگوں'' کے محدود علم سے خوفزدہ ہیں کہ وہ نظیر کو میر کا ہم پلہ نہ سمجھ بیٹھیں۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ محمد حسین آزاد سے اب تک اردو زبان وادب کی جتنی بھی تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں نظیر اکبر آبادی کے ساتھ مسلسل ناانصافی ہوتی رہی ہے۔ صرف رام بابو سکسینہ کی ''تاریخ ادب اردو ہے کہ جس میں نظیر کی ہلکی سی پہچان ہوتی ہے۔ نظیر کے ''جمہوری ذہن'' اور معاشرے کی تصویر کشی'' وغیرہ کے پیش نظر چند مقالے ضرور لکھے گئے جن میں پروفیسر سید احتشام حسین اور مجنوں گورکھپوری کے مقالے قابلِ غور ہیں۔ لیکن ترقی پسند نقادوں نے انہیں ''موضوع'' نہیں بنایا اور نظیر کو ایک ''جمہوری/سیکولر'' شاعر ثابت کرنے سے بات آگے نہیں بڑھی۔ علامہ نیاز فتحپوری صاحب نے 'نگار' کا نظیر اکبر آبادی نمبر نکال کر پہلی بار اس شاعر کے کلام کی قدر و قیمت کا احساس دلایا۔ رام بابو سکسینہ نے نظیر اکبر آبادی کو ایک ناصح اور فلسفی شاعر کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے لکھا:

''اگر نظیر کے کلام میں سے ان کے معمولی اشعار نکال ڈالے جائیں تو ان کا شمار بڑے بڑے فلسفیوں اور ناصح شعراء میں ہوسکتا ہے ان کے اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ولی کامل دنیا و مافیھا کی بے ثباتی اور بے حقیقی پر پرزور لکچر دے رہا ہے اور ایک دوسری زندگی کی تعلیم ہم کو دیتا ہے، جو رذائل اور مصائب سے بالکل پاک ہے۔ ان کی دس گیارہ ایسی دلچسپ اور مؤثر نظمیں ہیں جن کے اکثر اشعار فقیر اور

سادھو خوش الحانی سے پڑھ پڑھ کے ہمارے دلوں کو بیتاب کرتے ہیں۔ اس قسم کی نظموں میں وہ ''دنیا ہیچ ست وکار دنیا ہمہ ہیچ'' کے پوری طرح سے قائل ہیں وہ خیر وخیرات کے بہت معروف ہیں اور دنیا کو مزرع آخرت سمجھتے ہیں، ان کی تمثیلیں بہت اعلیٰ اور دلکش ہوتی ہیں۔ ان کی نظم ''موت پر'' اور 'بنجارہ نامہ' مغرور اور سرکش لوگوں کے لیے ایک تازیانہ عبرت ہے اور ان کو آگاہ کرتا ہے کہ دنیا دار فانی ہے اس کو چھوڑ و اور عاقبت کی فکر کرو'۔ (تاریخ ادب اردو دوسرا ایڈیشن ص 291)

رام بابو سکسینہ اس بات کو بخوبی سمجھ رہے تھے کہ نظیر ایک بڑا اور اہم شاعر ہے یہی وجہ ہے کہ نظیر کا مطالعہ کرتے ہوئے انہیں سعدی شیرازی کی یاد آئی۔ تحریر فرماتے ہیں۔

''نظیر کا مقابلہ اس معنی میں شیخ سعدی سے خوب ہوسکتا ہے۔ کیونکہ دونوں کا کلام صاف اور سلیس اور دونوں میں تصوف کا رنگ ہے، دونوں عاشقانہ رنگ کے استاد اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اور اپنے اپنے رنگ کے نصیحت گو بھی ہیں''۔ (ایضاً ص292)

آگے تحریر کرتے ہیں!

''......ان (نظیر) کی صوفیانہ نظمیں بہت ہی اعلیٰ درجہ کی ہیں اور اس حیثیت سے ان کا مقابلہ کسی دوسری زبان کے بہتر سے بہتر اخلاقی شاعر سے ہوسکتا ہے''۔

''نظیر کی وسیع النظری آزاد خیالی، ہمہ گیری اور بے تعصبی ایسی خصوصیات ہیں جو ان کے کلام کو تمام دوسرے شعراء کے کلام سے ممیز اور ممتاز کرتی ہیں''۔ (ایضاً ص292)

رام بابو سکسینہ نے نظیر کو ''حقیقی ہندوستانی شاعر'' کہا اس لیے بھی کہ ''ان

کے خیالات، ان کی زبان، ان کے مضامین سب مقامی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔''

رام بابو سکسینہ اردو ادب کی تاریخ لکھ رہے تھے صرف نظیر اکبر آبادی ان کے لیے موضوع نہیں بنے تھے اس کے باوجود وہ پہلے تاریخ نویس ہیں کہ جنہوں نے نظیر کو موضوع بنایا اور اپنے ''خاص نقطۂ نظر'' سے اردو ادب میں ان کی اہمیت بتانے کی کوشش کی۔ وہ نظیر کو جدید رنگ کا پیشرو تصور کرتے ہیں اور اردو زبان میں ان کی خدمت کا اعتراف کرتے ہیں۔ ان کا یہ جملہ بہت اہم ہے کہ ''جو چیز نظیر کی خامی اور کمزوری سمجھی جاتی ہے وہی ہماری رائے میں فی الحقیقت ان کی بڑی خصوصیت اور صفت ہے'' تحریر کیا ہے:

''انہوں نے ایسے الفاظ سے بہت فائدہ اٹھایا جن کو شعراء ادنیٰ اور بازاری سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں، چونکہ ایسے الفاظ مروجہ مضامین شعر سے میل نہیں کھاتے اس وجہ سے عام شعراء ان کو معمولی اور سوقیانہ سمجھ کر ترک کرتے ہیں اور شعر میں ان کو داخل کرنا خلاف شان سمجھتے ہیں، نظیر نے کمال کیا کہ ایسے ہی الفاظ کو اپنے اشعار میں جگہ دی اور دنیا کو دکھلا دیا کہ ان میں وہ خوبیاں چھپی ہوئی ہیں جن کو ظاہر بیں نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں''۔

(تاریخ ادب اردو دوسرا ایڈیشن صفحہ 294)

رام بابو سکسینہ نے نظیر کی مستعمل لغات تین حصوں میں تقسیم کی ہے اور اس موضوع پر بات صاف کر دی ہے۔

(۱) ایسے الفاظ جو ان کے ابتدائی رنگ کے کلام میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور اب بالکل خلاف تہذیب سمجھے جاتے ہیں۔

(۲) ایسے الفاظ جو معمولاً اردو شاعری کے مایۂ بساط ہیں۔

(۳) وہ جواہر ریزے جن سے حسن شعر بڑھ جاتا ہے اور خزانہ زبان مالا مال ہو جاتا ہے۔

رام بابو سکسینہ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ نظیر جدید رنگ کے پیش رو تھے۔ محمد حسین آزاد اور حالی اور انیس اور دبیر پر ان کی شاعری کے اثرات موجود ہیں۔ بلاشبہ نظیر اکبرآبادی ایک تخلیقی مصور شاعر تھے انہوں نے آوازوں کی جو دنیا خلق کی اور جو متحرک تصویریں پیش کیں ان کا اثر اردو شاعری پر بڑا گہرا ہوا۔ اردو نظم کی بنیاد مضبوط کرنے میں ایک جانب انگریزی نظموں کے ترجموں نے بڑا حصہ لیا ہے اور دوسری جانب نظیر اکبرآبادی کی نظموں کے رنگ و آہنگ نے۔

سکسینہ نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ نظیر اکبرآبادی نے نئے نئے مضامین اختیار کر کے اردو ادب کو بہت وسعت دی، وہ معمولی معمولی باتوں کے بیان میں ایسی دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں کہ جو دوسروں کے یہاں اعلیٰ مضامین میں بھی نہیں پائی جاتی۔ نظیر کے گہرے مطالعے کے بعد ہی کوئی یہ بات اتنے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہے۔

"ان کی تحریر سادہ اور بے تکلف، اور ان کا بیان صاف اور اصلیت کے مطابق ہوتا ہے مگر مجرد نیچر کی پرستش سے وہ ناواقف ہیں۔ جنگلوں اور پہاڑی چوٹیوں کا حال ان کے یہاں نہیں ہے۔ قدرتی مناظر کا فوٹو وہ صرف اسی حالت میں کھینچتے ہیں جب ان مناظر کا تعلق انسان سے ہوتا ہے۔

(تاریخ ادب اردو دوسرا ایڈیشن ص296)

نظیر اکبرآبادی عوام کی سائیکی (Psyche) میں جذب ہیں اور عوامی نفسی توانائی (Psychic Energy) کی نمائندگی کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کا ایک اپنا منفرد اجتماعی کردار ہے۔ یہ اجتماعی کردار (Collective

Character) شعری تجربوں کی تخلیق میں جذب ہے، اسی اجتماعی کردار کی وجہ سے لوک گیتوں اور لوک کہانیوں کا حسن شامل ہوا ہے، اپنی مٹی کی سگندھ میں جذب یہ شاعری اردو کی بوطیقا میں ایک فینومینن (Phenomenon) بن گئی ہے۔نظیر کا آرٹ لوک ادب کی کئی اہم خصوصیات لئے ہوئے ہے مثلاً تجربوں کا عام فہم اظہار کہ جس میں شعریت اور موسیقیت موجود رہتی ہے۔ایک کے بعد دوسرے منظر یا ایک تصویر کے بعد دوسری تصویر کا مسلسل ظہور اور قصہ بیان کرنے کا دلچسپ انداز وغیرہ۔ نظیر کا افسانوی مزاج تمثیلیت اور ڈرامائیت سے مناظر اور تصویروں کو پرکشش اور دلکش بنا دیتا ہے۔لوک ادب کی ایک اور بنیادی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ مختلف قسم کے آہنگ اور مختلف قسم کی حرکات سے ذہن متاثر ہوتا رہتا ہے۔نظیر کے کلام کی بھی یہ ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ایک ہی نظم میں تجربوں کے کئی آہنگ ملتے ہیں اور ساتھ ہی مختلف قسم کی متحرک کیفیتیں موجود رہتی ہیں۔طربیہ آہنگ کچھ دیر بعد المیہ آہنگ بن جاتا ہے دوسرا منظر پہلے منظر سے مختلف ہو جاتا ہے اور بات مکمل ہو جاتی ہے۔جس طرح لوک گیت لوگوں کو یاد رہے اسی طرح نظیر کے اشعار سے بھی لوگوں نے صرف لطف حاصل نہیں کیا بلکہ ان شعار کو یاد بھی رکھا۔ان کے اشعار زبان زد ہو گئے۔اپنے عہد کی زبان لئے یہ اشعار اپنی سادگی اور تازگی سے بھی متاثر کرتے رہے ہیں، بہت سی نظموں کے بند ایسے ہیں جو اپنی اپنی جگہ ایک منظر اور تصویر ہیں لہٰذا پڑھے۔ سننے والوں کے ذہن پر یہ منظر نقش ہوتے رہے لوگوں نے نظیر کے بندوں کو تصویروں کی صورت اور مناظر کی صورت یاد رکھی۔ان تصاویر و مناظر میں سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں کی دھڑکنیں موجود رہی ہیں۔تمثلیں اور کئی واقعات 'فکشن' بن گئے ہیں۔نظیر کی شاعری نے لوگوں کے جذبات کو خوب خوب متاثر کیا ہے ہنسایا اور خوب ہنسایا ہے اور اچانک خاموش بھی کر دیا ہے، زندگی کی بے ثباتی کے ذکر اور غربت کی زندگی کا ماتم

کرتے ہوئے انہوں نے المناک فضاؤں کی تشکیل کی ہے۔

اچھی نظموں میں ایک مست قلندر ملتا ہے جو جھومتا جھومتا اپنے خاص انداز سے اپنی بات کہہ دیتا ہے۔ لہک لہک کر قاری کو اپنی کیفیت میں شریک کر لیتا ہے، لفظوں کا آہنگ پڑھنے سننے والوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ لفظوں کا ایک سیلاب سا امڈ پڑتا ہے، لفظوں اور مصرعوں کی تکرار سے مختلف قسم کی فضاؤں کی تشکیل ہوتی رہتی ہے، کہا جاتا ہے نظیر اکبرآبادی کو موسیقی کے فن سے بھی گہری دلچسپی تھی ممکن ہے لفظوں کے انتخاب اور تشکیل میں اس سے مدد ملی، کلاسیکی گانوں کے بولوں کی طرح ان کے کلام میں ایسے لفظوں کی کمی نہیں ہے کہ جن کی آواز سے مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ بنجارہ نامہ، ہولی، پیسا، کوڑی، آندھی، آگرے کی ککڑی، خوشامد، آدمی نامہ، روٹیاں، کلجگ، دنیا دھوکے کی ٹٹی ہے، برسات کی بہاریں، دنیا بھی کیا تماشا ہے، وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں لفظوں اور ان کے آہنگ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

نظیر اکبرآبادی کی بعض نظموں میں لطف وانبساط حاصل کرتے اور پاتے پاتے اچانک محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی جو تصویر تھی اور جس سے ہم لطف وانبساط پا رہے تھے وہ گم ہوگئی ہے اور اس کی جگہ ایک دوسری تصویر سامنے آگئی ہے، زندگی کے تعلق سے کچھ اور ہی سرگوشیاں کر رہی ہے مثلاً پہلے یہ تصویر اپنی جہتوں کے ساتھ آتی ہے:

جب آدمی کے پیٹ میں آتی روٹیاں پھولی نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں
آنکھیں پری رخوں سے لڑاتی ہیں روٹیاں سینے اپر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں
جتنے مزے ہیں سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی سے جس کا ناک تلک پیٹ ہے بھرا کرتا پھرے ہے کیا وہ اچھل کود جابہ جا
دیوار پھاند کر کوئی کوٹھا اچھل گیا ٹھٹھا، ہنسی، شراب، صنم ساقی اس سوا
سو سو طرح کی دھوم مچاتی ہیں روٹیاں

جس جا پہ ہانڈی، چولہا، توا اور تنور ہے ۔۔۔ خالق کی قدرتوں کا اسی جا ظہور ہے
چولہے کے آگے آنچ جو جلتی حضور ہے ۔۔۔ جتنے ہیں نور سب میں یہی خاص نور ہے
اس نور کے سبب نظر آتی ہیں روٹیاں

اور پھر دوسری تصویر اس طرح ابھر آتی ہے۔

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے ۔۔۔ یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے ۔۔۔ ہم تو نہ چاند سمجھیں، نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

پھر پوچھا اس نے کہئے یہ ہے دل کا نور کیا ۔۔۔ اس کے مشاہدے میں ہے کھلتا ظہور کیا
وہ بولا سن کے تیرا گیا ہے شعور کیا ۔۔۔ کشف القلوب اور کشف القبور کیا
''جتنے ہیں کشف سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں''

روٹی نہ پیٹ میں ہو تو پھر کچھ جتن نہ ہو ۔۔۔ میلے کی سیر خواہش باغ و چمن نہ ہو
بھوکے غریب دل کی خدا سے لگن نہ ہو ۔۔۔ سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بھجن نہ ہو
اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

نظیر کی نظمیں پڑھتے جایئے تخیل اور جذبے کی ہم آہنگی اور ان کے جذباتی اور فنکارانہ اظہار اور پر آہنگ اسلوب کی پہچان ہوتی جائے گی۔ شاعر اخلاقی ہدایات نہیں دیتا وہ معاشرتی اور اخلاقی آواز کو اپنے تخیل اور جذبے میں شدت سے جذب کرتا ہے۔ یہ شاعری اپنے وقت کی سچائیوں کو لئے اپنے عہد کی زبان بن گئی ہے، زندگی پر جم کر تنقید کرتی ہے لیکن شعری صداقت اور شاعری کے حسن کو لئے ہوئے!

'Imagination and Fancy' میں ہنٹ (Leigh Hunt) نے شاعری کی جو تعریف کی ہے نظیر اکبر آبادی کی شاعری اس پر پوری اترتی ہے، اس نے کہا تھا۔

(Poetry is) the utterance of a Passion for truth, beauty and power, embodying and illustrating its conceptions by imagination and fancy...."

اس کے بعد اس نے کہا ہے:

"Poetry begins where matter of tact or science ceases to be merely such and to exhibit a further truth, that. is tosay, the connexion it has with the world of emotion....."

بلاشبہ یہ شاعری ان احساسات اور جذبات کی شاعری ہے جو سچائی، حسن اور توانائی کی دین ہیں نظیر اکبر آبادی تخیل اور فینسی (Fancy) کے ایک بڑے شاعر ہیں جو روحانی کیف پیدا کر کے جمالیاتی انبساط اس طرح عطا کرتے ہیں کہ وجد طاری ہو جاتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی کی شاعری زندگی، ماحول اور معاشرے کی ایسی جمالیاتی تشریح کرتی ہے کہ ذہن حالات اور ماحول کے انتشار اور تضادات کو اپنی گرفت میں پانے لگتا ہے اور اس طرح ایک عمدہ اور بہتر خواب کے التباسات (illusions) بھی پیدا ہونے لگتے ہیں یہ شاعری صرف حالات سے آشنا نہیں کرتی یا حالات کو کارٹون کی صورت پیش نہیں کرتی بلکہ اس طرح اثر انداز بھی ہوتی ہے کہ کلام کے اندر جو داخلی سچائی ہے اس پر یقین آ جائے۔ چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

دنیا میں پادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی اور مفلس وگدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زر دار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا   شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا   یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور   یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور   شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں   بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نمازیاں   اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان وارے ہے آدمی   اور آدمی پہ تیغ کو مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی   چلا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

چلتا ہے آدمی ہی مسافر ہو لے کے مال   اور آدمی ہی مارے ہے پھانسی گلے میں ڈال
یاں آدمی ہی صید ہے اور آدمی ہی جال   سچا بھی آدمی ہی نکلتا ہے میرے لال
اور جھوٹ کا بھرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی شادی ہے اور آدمی بیاہ   قاضی وکیل آدمی اور آدمی گواہ
تاشے بجاتے آدمی چلتے ہیں خواہ مخواہ   دوڑے ہیں آدمی ہی تو مشعل جلا کے راہ
اور بیاہنے چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یہاں آدمی نقیب ہو بولے ہے بار بار   اور آدمی ہی پیادے ہیں اور آدمی سوار
حقہ صراحی جوتیاں دوڑیں بغل میں مار   کاندھے پہ رکھ کے پالکی ہیں دوڑتے کہار
اور اس میں جو پڑا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی دکانیں لگا لگا   اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خونچا
کہتا ہے کوئی ''لو'' کوئی کہتا ہے ''لا رے لا''   کس کس طرح کی بیچیں ہیں چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

طبلے، مجیرے، دائرے، سارنگیاں بجا   گاتے ہیں آدمی ہی ہر اک طرح جابہ جا
رنڈی بھی آدمی ہی نچاتے ہیں گت لگا   اور آدمی ہے ناچے ہیں اور دیکھ پھر مزا
جو ناچ دیکھتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی لعل وجواہر ہیں بے بہا   اور آدمی ہی خاک سے بدتر ہے ہوگیا
کالا بھی آدمی ہے کہ الٹا جو جوں توا   گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا ہے چاند کا
بد شکل بدنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اک آدمی ہیں جن کے یہ کچھ زرق برق ہیں   روپے کے جن کے پاؤں ہیں سونے کے فرق ہیں
جھمکے تمام غرب سے لے تابہ شرق ہیں   کمخواب، تاش، شال، دوشالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

حیراں ہوں یارو، دیکھو تو کیا یہ سوانگ ہے   اور آدمی ہی چور ہے اور اپی تھانگ ہے
ہے چھینا جھپٹی اور کہیں مانگ تانگ ہے   دیکھا تو آدمی ہی یہاں مثل رانگ ہے
فولاد سے گڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مرنے میں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار   نہلا دھلا اٹھاتے ہیں کاندھے پہ سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں روتے ہیں زارزار   سب آدمی یہ کرتے ہیں مردے کے کاروبار
اور وہ جو مر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تاوزیر   یہ آدمی ہی کرتے ہیں سب کارِ دل پذیر
یاں آدمی مرید ہے اور آدمی ہی پیر   اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی   (آدمی)

جب آدمی کے حال پر آتی ہے مفلسی کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

کہئے تو اب حکیم کی سب سے بڑی ہے پریشاں تعظیم جس کی کرتے ہیں نواب اور خاں
مفلس ہوئے تو حضرت لقمان کیا ہے یاں عیسیٰ بھی ہو تو کوئی نہیں پوچھتا میاں
حکمت حکیم کی بھی ڈوباتی ہے مفلسی

مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر دیتا ہے اپنی جان وہ ایک ایک نان پر
ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر جس طرح کتے لڑتے ہیں اک استخوان پر
ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی

لازم ہے گر غمی میں کوئی شور غل مچائے مفلس بغیر غم کے ہی کرتا ہے ہائے ہائے
مرجاوے گر کوئی تو کہاں سے اسے اٹھائے اس مفلسی کی خواریاں کیا کیا کہوں میں ہائے
مردے کو بے کفن کے گڑاتی ہے مفلسی

بی بی نتھ نہ لڑکوں کے ہاتھوں کڑے رہے کپڑے میاں کے بنئے کے گھر میں پڑے رہے
جب کڑیاں بک گئیں تو کھنڈر میں پڑے رہے زنجیر ہے نہ کواڑ نہ پتھر گڑے رہے
آخر کو اینٹ اینٹ کھداتی ہے مفلسی

نقاش پر بھی زور جب آ مفلسی کرے سب رنگ دم میں کر دے مصور کے کر کرے
صورت ہی اس کی دیکھ لے منہ کھینچ رہے پڑے تصویر اور نقش میں کیا رنگ وہ
اس کے تو منہ کا رنگ اڑاتی ہے مفلسی

عاشق کے حال پر بھی جب آ مفلسی پڑے معشوق اپنے پاس نہ دے اس کو بیٹھنے
آوے جو رات کو تو نکالے وہیں اسے اس ڈر سے یعنی رات کو دھتا کہیں نہ دے
تہمت یہ عاشقوں کو لگاتی ہے مفلسی

مفلس جو بیاہ بیٹی کا کرتا ہے بول بول　　پیسا کہاں جو جا کے وہ لاوے جہیز مول
جو روکا وہ گلا ہے کہ پھوٹا ہو جیسے ڈھول　　گھر کی حلال خوری تلک کرتی ہے ٹھٹھول
ہیبت تمام اس کی اٹھاتی ہے مفلسی

کوئی شوم، بے حیا کوئی بولا ''نکھٹو'' ہے　　بیٹی نے باپ تو میرا نکھٹو ہے
بیٹے پکارتے ہیں کہ بابا نکھٹو ہے　　بی بی یہ دل میں کہتی ہے ''اچھا نکھٹو ہے''
آخر نکھٹو نام دھراتی ہے مفلسی

مفلس کا دردِ دل کوئی ٹھانتا نہیں　　مفلس کی بات کو بھی کوئی مانتا نہیں
ذات اور حسب نسب کو کوئی جانتا نہیں　　صورت بھی اس کی پھر کوئی پہچانتا نہیں
یاں تک نظر سے اس کو گراتی ہے مفلسی

چولہا توانہ پانی کے مٹکے میں آب ہی ہے　　پینے کو کچھ نہ کھانے کو اور نے رکابی ہے
مفلس کے ساتھ سب کے تئیں بے حجابی ہے　　مفلس کی جورو سچ ہے کہ ہاں سب کی بھابی ہے
عزت سب اس کے دل کی گنواتی ہے مفلسی

کیسا ہی آدمی ہو پر افلاس کے طفیل　　کوئی گدھا کہے اسے ٹھہرادے کوئی بیل
کپڑے پھٹے تمام، بڑھے بال پھیل پھیل　　منھ خشک دانت زرد، بدن پر جما ہے میل
سب شکل قیدیوں کی بناتی ہے مفلسی

ہر آن دوستوں کی محبت گھٹاتی ہے　　جو آشنا ہیں ان کی تو الفت گھٹاتی ہے
اپنے کی مہر، غیر کی چاہت گھٹاتی ہے　　شرم وحیا وعزت وحرمت گھٹاتی ہے
ہاں ناخن اور بال بڑھاتی ہے مفلسی

دنیا میں لے کے شاہ سے اے یارو تا فقیر　　خالق نہ مفلسی میں کسی کو کرے اسیر
اشراف کو بناتی ہے اک آن میں فقیر　　کیا کیا میں مفلسی کی خرابی کہوں نظیر
وہ جانے جس کے دل کو جلاتی ہے مفلسی　　(مفلسی)

●

دل خوشامد سے ہر اک شخص کا کیا راضی ہے　　آدمی، جن وپری، بھوت بلا راضی ہے
بھائی فرزند بھی خوش باپ چچا راضی ہے　　شاہ مسرور، غنی شاہ، گدا راضی ہے
جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

اپنا مطلب ہو تو مطلب کی خوشامد کیجئے　　اور نہ ہو کام تو اس ڈھب کی خوشامد کیجئے
اولیاء انبیاء اور رب کی خوشامد کیجئے　　اپنے مقدور غرض سب کی خوشامد کیجئے
جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

گر بھلا ہو تو بھلے کی بھی خوشامد کیجئے　　اور برا ہو تو برے کی بھی خوشامد کیجئے
پاک، ناپاک سڑے کی بھی خوشامد کیجئے　　کتے بلی وگدھے کی بھی خوشامد کیجئے
جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

بی بی کہتی ہے "میاں تیرے میں صدقے جاؤں"　　ساس بولے کہیں مت جا ترے صدقے جاؤں
خالہ کہتی ہے کہ کچھ کھا ترے صدقے جاؤں　　سالی کہتی ہے کہ "بھیا ترے صدقے جاؤں"
جو خوشامد کرے خلق اس کے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

ہم نے ہر دل میں خوشامد کی محبت دیکھی　　پیار اخلاص وکرم، مہر و مروت دیکھی
دل بروں میں بھی خوشامد ہی کی الفت دیکھی　　عاشقوں میں بھی خوشامد ہی کی چاہت دیکھی
جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

(خوشامد)

کلام کے اندر جو داخلی سچائی ہے اس پر یقین آجاتا ہے، اس شاعری کی اپنی داخلی منطق ہے اس کی اپنی انفرادی خصوصیات ہیں، اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا رشتہ کئی سطحوں پر طبقاتی زندگی سے قائم ہو جاتا ہے، اکثر نظموں میں شاعر ایک خیال سے دوسرے خیال کی جانب تیزی سے بڑھتا ہے لیکن خیال اور خیال کا رشتہ قائم رہتا ہے اور اس سے جمالیاتی تاثر ملتا رہتا ہے، تجربے کی اندرونی جمالیاتی تشکیل یا تجربے کے اندرونی حسن کی تشکیل کی وجہ سے انبساط حاصل ہوتا رہتا ہے، نظیر کی فنکاری یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے اپنے تجربوں کو بڑی آسانی سے منتقل کر دیتے ہیں، اس عمل میں سماج کی جانب دریچہ کھل جاتا ہے اور نرم گرم ہواؤں کی جانب سے بیداری پیدا ہوتی رہتی ہے۔ واقعات اور محسوسات کی اہم آہنگی سے جو شعری فضا بنتی ہے اور جس نوعیت کی وسعت نظر آتی ہے اس سے شاعر کی بصیرت کی پہچان ہوتی ہے۔ معنوی اعتبار سے نظیر کے شعری تجربے بسیط ہیں رفعتِ تخیل، شدتِ احساس اور جذباتی خلوص کی وجہ سے ان کی شاعری جاذب نظر بن گئی ہے۔ ان کی نظموں میں شاعر کی سرمستی قاری کو حد درجہ متاثر کرتی ہے۔ بیک وقت غم انگیز اور مسرت بخش شاعری اردو بوطیقا میں ایک نیا جادو ہے۔

نظیر اکبرآبادی نے شعورِ زندگی کو جس طرح سچائیوں کی مختلف کیفیتوں سے آشنا رکھا اور جس طرح وہ ظرافت، مزاح اور طنز کے ساتھ دلچسپ انداز سے سچائیوں کا انکشاف کرتے رہے ہیں اس کی مثال نہیں ملتی۔ جانی پہچانی سچائیوں کے یہ انکشافات غیر معمولی حیثیت رکھتے ہیں ان کے فن میں سچائی اور جھوٹ دونوں کا انکشاف مسلسل ہوتا رہتا ہے وہ جبلی اظہار اور اجتماعی احساس کے شاعر ہیں۔ نظموں میں جبلی اظہار کا اضطراب بھی ہے اور اجتماعی احساس کی پیشکش بھی۔

میں نے کہا کہ نظیر اکبرآبادی سات رنگوں کے شاعر ہیں، انہوں نے ایک قوس قزح کھینچ کر رکھ دی ہے، ایک رنگ زندگی کے جلال و جمال کا رنگ ہے، فطرت کی خوبصورت تصویریں اپنے آہنگ کے ساتھ ملتی ہیں۔ نظیر کی جمالیات کا یہ بہت ہی پرکشش پہلو ہے۔ کیٹس نے کہا تھا۔ Beauty is truth is beauty یعنی حسن سچائی ہے اور سچائی حسن، نظیر کے کلام کا خصوصاً یہ پہلو اس خیال کی تصدیق کرتا ہے، جو حسن ہے وہ حقیقت ہے سچائی ہے اور جو حقیقت اور سچائی ہے وہ حسن ہے، شاعر کے وژن میں بہار کا حسن جس طرح بکھرا ہوا اور پھیلا ہوا ہے اس کی مثال اردو شاعری میں نہیں ملتی، بہار کے حسن کے ساتھ محبوب کے حسن اور اس کے ساتھ اپنے جمالیاتی تاثرات کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے، ایسے تاثرات سے شاعر کی جمالیات میں کشادگی پیدا ہوگئی ہے۔

●

شب کو چمن میں واہ، واہ کیا ہی بہار تھی مچی　　پھول کھلے تھے پھول پھول، غنچے کھلے کلی کلی
بیلا، چنبیلی، رائے بیل، موتیا، جوہی، سیوتی　　بادِ صبا بھی چلتی تھی، عطر و گلاب میں بسی
حوض پڑے چھلکتے تھے، نہر ہلوریں لیتی تھی　　شوخ بغل میں غنچہ لب، لے کے نشوں کی تازگی
عیش و طرب کی لہریں رات جب آدھی ڈھل گئی　　اس میں کہیں سے ہائے عقب نکلی جو کھر چاندنی

صبح کے شور سے ہڑ بڑا، یار نے گھر کی راہ لی
ہم بھی دعا میں آگئے، مفت بہار لٹ گئی

رات تو کیا ہی عیش کی، ٹھہری تھی آکے انجمن　　تارے کھلے تھے مہ رتن، پھول کھلے چمن چمن
نرگس و نارو یاسمن، سوسن و طرہ نسترن　　کبک و تدرو خندہ زن، بلبل و قمری نعرہ زن
یا بغل میں گل بدن، سرخ گلے میں پیرہن　　سینہ بہ سینہ تن بہ تن، عیش و طرب کے سب برن
اس میں رقیب دل شکن، آیا گجر کا کر کے فن　　تھال کہیں سے لاشتاب دی ہے بجا ٹھنن ٹھنن

صبح کے ڈر سے ہڑ بڑا، یار نے گھر کی راہ لی
ہم بھی دغا میں آ گئے مفت بہار لٹ گئی

باغ میں شب کو واہ واہ کیا ہی مزوں کے گھور تھے   طوطی و بگلے، مور تھے، فاختوں کے بھی شور تھے
شوخ پر اپنے زور تھے اس کے بھی ہم پہ زور تھے   توڑے، کڑے دبور تھے، چھلے بھی پور پور تھے
یار ہمارا چاند تھا، چاند کے ہم چکور تھے   دونوں چکئی و چکوا تھے دونوں پتنگ وڈور تھے
مے کے نشوں کے شور تھے کپڑے بھی شور بور تھے   بولا رقیب دن دیئے، دوڑیو یار و چور تھے

صبح کے ڈر سے ہڑ بڑا، یار نے گھر کی راہ لی
ہم بھی دغا میں آ گئے مفت بہار لٹ گئی

کیا ہی مزے تھے رات کو یارو میں تم سے کیا کہوں   صحن چمن ارم نمو، ڈالیاں جھو میں سرنگوں
شوخ بغل میں ......عیش و طرب فزوں فزوں   مے کے بہے آ کے خوں، چہرے نشوں میں لالہ گوں
یار کے ناز اور فسوں، اپنے بھی عشق اور جنوں   جام پکارے منھ لگوں، عیش پکارے دم نہ لوں
اس میں رقیب بدشگوں، کچھ نہ بنا تو وہ زبوں   پچھلے ہی پہرے بن کے مرغ، بولا ہی آ کے ککڑوں کوں

صبح کے ڈر سے ہڑ بڑا، یار نے گھر کی راہ لی
ہم بھی دغا میں آ گئے، مفت بہار لٹ گئی

لوٹے ہیں کیا ہی ہم نے واہ رات مزے بہار کے   انکھڑیوں سرمہ دار کے، لعل مسی نگار کے
کاکلِ مشک بار کے طرۂ آبہ دار کے   مے کے نشوں کے تار کے، پھولوں کے شاخسار کے
باہیں گلے میں یار کے، بوس و کنار پیار کے   ہاتھوں میں گجرے تار کے، لچھے گلوں میں ہار کے
بھاگا رقیب یار کے ہاتھوں پہ ہاتھ مار کے   کچھ نہ بنا تو دی اذاں کوٹھے پہ جا کے یار کے

صبح کے ڈر سے ہڑ بڑا، یار نے گھر کی راہ لی
ہم بھی دغا میں آ گئے، مفت بہار لٹ گئی

رات ہوئی ، تھے واہ واہ کیا ہی نشے رسا رسا　　پیتے تھے مے بسا بسا، پھولوں میں ہم بسا بسا
شوخ بغل میں چاند سا، دیتا تھا بوسے ہنس ہنسا　　زلفوں میں اس کی دل پھنسا آن واداؤں میں جی بسا
جامۂ بدن میں چس چسا پھول ہوا تھا بس بسا　　نیندوں میں یار، رسمسالے تھا جمائی کسمسا
اس میں رقیب گرگ ساکر کے سحر کا دسوسا　　لا کے نقارہ یا دہل دھوں دھوں بجا کس کسا

صبح کے ڈر سے ہڑبڑا، یار نے گھر کی راہ لی
ہم بھی دغا میں آگئے، مفت بہار لٹ گئی

کیا ہی نظیر رات کو، عیش کے تھے مقابلے　　مے کے نشے اہل چلے دل کے فراخ حوصلے
جی پر خوشی کے در کھلے، رنج وتعب کے حوصلے　　شوخ کے ناز چلبلے، بوسوں کے تھے معاملے
ناز و ادا کے چوچلے، عیش وطرب کے غلغلے　　یار لپٹ رہا گلے، دل میں خوشی کے ولولے
اس میں رقیب دم نہ لے، بولا ہی کر کے اشغلے　　باندھو کمر، مسافرو، کوچ کریں ہیں قافلے

صبح کے ڈر سے ہڑبڑا، یار نے گھر کی راہ لی
ہم بھی دغا میں آگئے، مفت بہار لٹ گئی

(بہار)

نظیرا کبرآبادی نے بہار کا مشاہدہ کرتے ہوئے رنگوں اور خوشبوؤں کو بھی محسوس بنادیا ہے۔ شب میں چمن میں آئی بہار طرح طرح سے متاثر کرتی ہے۔ ''پھول کھلے تھے پھول پھول، غنچے کھلے کلی کلی'' پھولوں اور کلیوں کی خوبصورتی کا بیان اس سے بہتر اور کیا ہوسکتا تھا۔ عطر وگلاب میں بسی بادصبا کے ساتھ بیلا، چنبیلی، رائے بیل، موتیا، جوہی، سیوتی سب کی خوشبوؤں کے تئیں بیدار کیا گیا ہے سب کے رنگوں کی یاد تازہ کی گئی ہے۔ اور پھر جمال فطرت کو جمالِ محبوب میں جذب کر دیا گیا ہے، شب میں چمن میں جو بہار آئی ہے اس کی تکمیل شوخ محبوب کے حسن سے ہوتی ہے ''غنچہ لب'' جمال محبوب کی علامت ہے، ظاہر ہے ایسی صورت میں نشہ اور بڑھ گیا ہے بڑی

تازگی آ گئی ہے نشے میں۔

شوخ بغل میں غنچہ لب، مے کے نشوں کی تازگی!

محبوب کا وجود ہی نشہ طاری کر دیتا ہے بہار کی آمد سے جو نشہ ہے وہ اور بھی تازہ ہو جاتا ہے۔

بہار کی شب، شب وصل ہے، عیش وطرب کی لہروں میں لمحے گزرتے جاتے ہیں، نرگس ویاسمن اور نسترن اپنے اپنے حسن اور اپنی اپنی خوشبوؤں کے ساتھ تو موجود ہی ہیں کیک، بلبل اور قمری کی خوبصورت آوازیں بھی کم جان لیوا نہیں ہیں، ان تمام خوشبوؤں اور ان تمام آوازوں کی قدر و قیمت اور بڑھ جاتی ہے جب وصل کے لمحے نصیب ہوتے ہیں، پھولوں کی خوشبوؤں اور پرندوں کی خوبصورت آوازوں اور جمال محبوب اور لذتِ وصل سب مل کر ایسی جمالیاتی وحدت بن جاتے ہیں کہ جن سے انبساط حاصل ہوتا ہے لذت حاصل ہوتی ہے۔

یار بغل میں گل بدن، سرخ گلے میں پیرہن

سینہ بہ سینہ تن بہ تن، عیش وطرب کے سب برن

محبوب چاند تھا میں چکور تھا، دونوں چکئی چکوا تھے دونوں پتنگ اور ڈور تھے۔

کیا ہی مزے تھے رات کو، یارو میں تم سے کیا کہوں

صحن چمن ارم نموں، ڈالیاں جھومیں سرنگوں

شوخ بغل میں ذوفنوں عیش وطرب فزوں فزوں

مے کے بہے تھے آکے خوں، چہرے نشوں میں لالہ گوں

بہار کی شب میں عاشق محبوب کے حسن و جمال کے افسوں میں مسلسل گرفتار رہتا ہے، وصل کے لمحوں میں اس پر جنون کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ بہار کو محبوب کے چہرے اور اس کے وجود پر دیکھتا ہے، محبوب آغوش میں ہے۔

—● باہیں گلے میں یار کے، بوس وکنار پیار کے

—● شوخ بغل میں چاندسا، دیتا تھا بوسے ہنس ہنسا

—● ناز دادا کے چوچلے، عیش وطرب کے غلغلے

—● یار لپٹ رہا گلے، دل میں خوشی کے ولولے

بہار کی اس شب میں رقیب بار بار ایسی حرکت کرتا ہے کہ صبح کے خوف سے محبوب اٹھ کر چلا جاتا ہے اور عاشق ہر بار یہ محسوس کرتا ہے کہ "مفت بہار لٹ گئی"

رقیب کے کردار سے نظیر کے چلبلے مزاج کی پہچان ہوتی ہے۔ ابھی رات گزرتی نہیں۔ ابھی پوری لذت حاصل ہوتی نہیں کہ رقیب بہار کی اس شب کا لطف بگاڑ دیتا ہے' رقیب' دراصل معاشرے کی اس قوت کی علامت ہے جو زندگی کے جلال وجمال اور محبوب کے حسن سے مکمل طور پر لطف اندوز ہونے نہیں دیتا،

اسی قسم کا تجربہ "چاندنی" اور جھڑی، میں ہے لیکن یہاں رقیب نہیں ہے ہوتا یہ ہے کہ۔

صبح ہوئی گجر بجا، پھول کھلے، ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا، جی ہی میں جی کی رہ گئی

(چاندنی)

اور:

ابر کھلا، ہوا گھٹی، بوندیں تھمیں، سحر ہوئی
پہلو سے یار اٹھ گیا، سب وہ بہار بہہ گئی

(جھڑی)

ان دونوں نظموں میں بھی نظیر اکبرآبادی کے احساسِ جمال کی خوب خوب پہچان ہوتی ہے۔

'چاندنی' کے چند بند ملاحظہ فرمایئے 'چاندنی' کے حسن پر کیسی نظر ہے اور چاندنی رات میں وصل کی لذت کیسی ہے۔

صحن چمن میں 'واہ' 'واہ' زور بچھی تھی چاندنی　　چاند ہلوریں لیتا تھا اور کھلی تھی چاندنی
آیا تھا یار گل بدن، پہن کے باد لازری　　چمکے تھی تار تار میں، مہ کی جھلک ذری ذری
بوس و کنار جام و مے عیش و طرب ہنسی خوشی　　اس میں کہیں سے یک بیک، مرغ سحر نے بانگ دی

صبح ہوئی گجر بجا، پھول کھلے، ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گا، جو ہی میں جی کی رہ گئی

کیا ہی مزے سے عیش کی رات تھیں کامیابیاں　　چھوٹیں تھیں ماہتاب کی نہروں میں ماہتابیاں
آگے چنی تھیں صف بہ صف مے کی کئی گلابیاں　　ہم کو نشوں کی مستیاں، یار کو نیم خوابیاں
سینوں میں اضطرابیاں آنکھوں میں بے حجابیاں　　اس میں فلک نے رشک سے ڈالیں یہ کچھ خرابیاں

صبح ہوئی گجر بجا، پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اُٹھ گیا، جی ہی میں جی کی رہ گئی

چاندنی، واہ چاندنی، کرتی تھی کیا جھلک جھلک　　چہک رہی تھیں بلبلیں، باغ رہا تھا سب مہک
جام کے لب سے ہر گھڑی نکلے تھی مے چھلک چھلک　　یار بغل میں غنچہ لب، بوسوں کی سو لپک لپک
عیش و طرب کی لذتیں ہونے لگیں جو یک بہ یک　　ایسے مزے میں عیش میں آہ کہیں سے ہک نہ دھک

صبح ہوئی گجر بجا، پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا، جی ہی میں جی کی رہ گئی

باغ تھا یا کہ خلد وہ، یا کہ بہشت، یا ارم　　یار تھا یا کہ حور وہ، یا کہ پری وہ یا صنم
چاندنی تھی وہ چاندنی، چاندنی کا رنگ جس سے کم　　پیتے تھے مے گھڑی گھڑی لیتے تھے بوسے دم بہ دم
دونوں نشوں میں مست ہو، سوئے پلنگ پہ جب کہ ہم　　عیش مزا تھا وصل کا اس میں نظیر ہے ستم

صبح ہوئی گجر بجا پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

(چاندنی)

یہ نظم بھی وصل کا خوبصورت تجربہ ہے، چاندنی رات میں وصل کے لمحوں کی لذت ہے، فطرت کا حسن وصل کے لمحوں کے حسن میں جذب ہوگیا ہے۔ چاندنی رات میں عاشق کا جنسی جذبہ صرف بیدار ہی نہیں ہوتا بلکہ عاشق جنسی لذت حاصل بھی کرتا ہے۔ رات گزر جاتی ہے صبح ہوتی ہے گجر کی آواز سنائی دیتی ہے نسیم سحر سے پھول کی خوشبو پھیلتی ہے تو اچانک احساس ہوتا ہے آرزو پوری نہیں ہوئی، وقت کو تھم جانا چاہئے تھا کچھ اور بھی چاہئے تھا ''بس جی ہی میں جی کی رہ گئی! مناظر فطرت اور فطرت کے حسن کی تصویروں کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے ابھارنا یقیناً بڑی بات ہے لیکن یہاں سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ شاعر نے اپنے حسی اور جنسی تجربے کو ان تصویروں میں جذب کر کے اسے ان کا آہنگ بنادیا ہے۔ اس نظم میں بھی لفظوں کے آہنگ نے مستی اور سرور کی ایک کیفیت پیدا کردی ہے۔ 'جھلک جھلک'' چھلک چھلک' لپک لپک'، سے احساس ہوتا ہے کہ نظیر لفظوں کے آہنگ کو کتنا اہم جانتے تھے۔ ان کی اور کئی نظموں میں لفظوں کے آہنگ کی گونج متاثر کرتی ہے۔

فطرت کے حسن و جمال سے متاثر نظیر کا جمالیاتی شعور محبوب کے جمال اور اس کے بدن کی کشش کو بھی جذب کئے رہا ہے۔ بہار، اور چاندنی، میں اس جمالیاتی شعور کا مشاہدہ کر چکے ہیں، 'جھڑی' بھی اس سلسلے کی ایک اہم نظم ہے، چند بند ملاحظہ فرمایئے!

رات لگی تھی، 'واہ واہ' کیا ہی بہار کی جھڑی
موسم خوش بہار تھا ابرو ہوا کی دھوم تھی
شمع و چراغ، گل بدن، بارہ دری تھی باغ کی
یار بغل میں غنچہ لب، رات اندھیری جھک رہی
منہ کے مزے، برائے غل، مے کے نشے گھڑی گھڑی
اس میں کہیں سے ہے ستم ایسی اک آ پون چلی

ابر کھلا، ہوا گھنی، بوندیں تھمیں، سحر ہوئی

پہلو سے یار اٹھ گیا، سب وہ بہار بہہ گئی

شب کو ہوئیں اہا اہا زور مزوں کی مستیاں　　بجلی کی شکلیں بتیاں، بوندیں پڑی برستیاں

سبز، دلوں کی بستیاں، جنس خوشی کی مستیاں　　دھوم جیون میں بستیاں چہلیں نرالی اکستیاں

اس میں فلک نے یک بیک لوٹیں دلوں کی بستیاں　　سارے نشے وہ لٹ گئے، کھو گئیں مے پرستیاں

ابر کھلا ہوا گھنی، بوندیں تھمیں، سحر ہوئی

پہلو سے یار اٹھ گیا، سب وہ بہار بہہ گئی

برسے تھیں کیا ہی جھوم جھوم رات گھٹائیں کالیاں　　کوئلیں بولیں کالیاں، بہہ چلے نالے نالیاں

بجلیوں کی اجالیاں، بارہ دری کی جالیاں　　عیش کی جھومیں ڈالیاں باہیں گلوں میں ڈالیاں

چلتی تھیں مے کی پیالیاں منہ پہ نشوں کی لالیاں　　اس میں فلک نے دوڑ کر، سب وہ ہوائیں کھالیاں

ابر کھلا، ہوا گھنی، بوندیں تھمیں، سحر ہوئی

پہلو سے یار اٹھ گیا سب وہ بہار بہہ گئی

ابر وہوا کے واہ واہ، شب کو عجب ہی زور تھے　　بھیگ رہا تھا سب چمن مینہ کے جھڑا کے زور تھے

غوک، پپیہے، مور تھے، جھینگروں کے بھی شور تھے　　بادہ کشی کے دور تھے، عیش وطرب کے چھور تھے

باغ سے تا بہ باغباں، جتنے تھے شور بور تھے　　آپڑے اس میں ناگہاں، یہ جو خوشی کے چور تھے

ابر کھلا، ہوا گھنی، بوندیں تھمیں، سحر ہوئی

پہلو سے یار اٹھ گیا، سب وہ بہار بہہ گئی

زور مزوں سے رات کو، برسے تھا مینہ جھمک جھمک　　بوندیں پڑیں ٹپک ٹپک، پانی پڑے جھپک جھپک

جام رہے چھلک چھلک، شیشہ رہے بھبک بھبک　　یار بغل میں بانمک، عیش وطرب تھے بے دھڑک

ہم بھی نشوں میں خوب چہک، لوٹتے تھے بہک بہک　　کیا ہی سماں تھا عیش کا اتنے میں آہ یک بہ یک

ابر کھلا، ہوا گھنی بوندیں تھمیں، سحر ہوئی　　پہلو سے یار اٹھ گیا، سب وہ بہار بہہ گئی

نظیر اکبرآبادی کی ایسی نظموں میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ سماج اور فطرت دونوں مشاہدۂ حسن میں رکاوٹ پیدا کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں، رقیب سماج کی نمائندگی کرتا ہے، نظیر نے اس کردار کو ایک دکھ دینے والا مسخرہ بنادیا ہے۔ مشاہدہ حسن کرتے ہوئے اور جسمانی لذت حاصل کرتے ہوئے ایک رومان پرور فضا موجود رہتی ہے جمالیاتی انبساط حاصل ہوتا رہتا ہے کہ اچانک یہ کردار ایک رکاوٹ (Obstracle) کی صورت رنگ میں بھنگ ڈال دیتا ہے۔ بدشگونی اس کردار سے منسوب ہوگئی ہے۔ ابھی عاشق اور محبوب دونوں وصل کی لذت حاصل کررہے ہوتے ہیں رات گزری بھی نہیں ہوتی کہ رقیب مرغ بن کر ککڑوں کوں ککڑوں کوں کرنے لگتا ہے اور صبح کے خوف سے محبوب گھر کی راہ لے لیتا ہے۔ کبھی یہ کردار نصف شب میں کوٹھے پر اذان دے دیتا ہے اور صبح کے ڈر سے ہڑ بڑا کر یار گھر کو لوٹ جاتا ہے۔ فطرت بھی شرارت کرتی رہتی ہے۔ بارش کی وجہ سے جنسی جذبات بھڑکتے ہیں، محبوب پاس ہوتا ہے اور ہوا کے جھونکے چل رہے ہوتے ہیں محبوب کے ساتھ عاشق اس رومانی ماحول میں گم ہے، جام رہے چھلک چھلک''۔ ''برسے تھا مینہ جھمک جھمک'' ''یار بغل میں بانمک'' ''عیش وطرب تھے بے دھڑک'' کہ اتنے میں فطرت کو شرارت سوجھتی ہے، ابر اچانک کھل جاتا ہے، بوندیں تھم جاتی ہیں اور سحر ہو جاتی ہے، یار پہلو سے کیا اٹھ جاتا ہے کہ جھڑی اور محبوب دونوں کا لطف جاتا رہتا ہے۔

جمال فطرت اور جمال محبوب مجموعی طور پر یہ کہا جائے جمال زندگی سے اچھی طرح لطف اندوز ہونے میں سماج اور فطرت دونوں کی جانب سے ایسی رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں جو انتہائی تکلیف دہ ہوتی ہیں۔

ان نظموں کے علاوہ ''برسات کا تماشا'' ''برسات اور پھسلن'' برسات کی

بہاریں'' اندھیری رات، وغیرہ ایسی نظمیں ہیں کہ جن میں نظیر اکبر آبادی کے احساسِ جمال کی پہچان ہوتی ہے۔

جشن زندگی کے اس بڑے اردو شاعر کی جمالیات کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کے ''رومانی نقطہ نگاہ اور اس کے مشاہدات اور جمالیاتی 'وژن' کا مطالعہ ضروری ہے۔ نظیر کے جمالیاتی وژن، کو سمجھنے میں مندرجہ ذیل اشعار بھی مدد کرتے ہیں۔

●

قاصد صبا کے دوڑے، ہر طرف منہ اٹھا کر — ہر کوہ و دشت کو بھی کہتے ہیں یوں سنا کر
ہاں سبز جوڑے پہنو، ہر دم نہا نہا کر — کوئی دم کو میگھ راجا، دیکھے گا سب کو آ کر

جب یہ نوید پہنچی، صحرا میں ایک باری — ہونے لگی ہاں پھر، برسات کی تیاری
چشموں میں کوہ کے بھی، ہوئی سب کی انتظاری — موسم کے جانور بھی آتے ہیں باری باری

ساون کے بادلوں سے، پھر آ گھٹا جو چھائی — بجلی نے اپنی صورت، پھر آن کر دکھائی
ہو مست رعد گرجا، کوئل کی کوک آئی — بدلی نے کیا مزے کی، رم جھم جھڑی لگائی

ہر گل بدن کے تن میں پوشاک ہے اکہری — پگڑی گلابی، ہلکی، یا گل انار گہری
صحن چمن میں ہے جو بارہ دری سنہری — اس میں سبھوں کی آ کر، ہے بزم عیش ٹھہری

●

بادل ہوا کے اوپر، ہو مست چھا رہے ہیں — جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا، جل تھل بنا رہے ہیں — گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں

جنگل میں اپنے تن پر، ہریالی سج رہے ہیں   گل پھول جھاڑ بوٹے کر اپنی دھج رہے ہیں
بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہے ہیں   اللہ کے نقارے، نوبت کے بج رہے ہیں

بادل لگا ٹکوریں، نوبت کی گت لگاویں   جھینگر جھنکار اپنی سرنائیاں بجاویں
کر شور مور بگلے، جھڑیوں کا منہ ہلاویں   پی پی کریں پپیہے مینڈک ملاریں گاویں

ہر جا بچھا رہا ہے سبزا ہرے بچھونے   قدرت کے بچھ رہے ہیں، ہر جا ہرے بچھونے
جنگلوں میں ہو رہے ہیں پیدا ہرے بچھونے   بچھوا دیئے ہیں حق نے کیا کیا ہرے بچھونے

سبزوں کی لہلہاہٹ، کچھ ابر کی سیاہی   اور چھا رہی گھٹائیں سرخ اور سفید کاہی
سب بھیگتے ہیں گھر گھر، لے ماہ تا بہ ماہی   یہ رنگ کوئی رنگے، تیرے سوا الٰہی

●

جو صحن باغ کا ہے وہ ہے دل کشا ہوا   آتی ہے جس میں گلشن فردوس کی ہوا
ہر سو نسیم چلتی ہے اور ہر طرف ہوا   ہلتی ہیں ڈالیاں سبھی ہر گل ہے جھولتا
کیا کیا روش روش پہ ہجوم بہار ہے
سرو سہی کھڑے ہیں قرینے سے نسترن   کو کو کریں ہیں قمریاں ہو کر شکر شکن
رابیل سیوتی سے بھرے ہیں چمن چمن   گلنار لالہ و گل و نسرین و نسترن
فوارے چھوٹ رہے ہیں رواں جوئبار ہے

●

میں نے نظیر اکبرآبادی کی نظم ''حسن و جمال کو غنیمت جانو'' کا ذکر کیا ہے، زندگی کے حسن و جمال پر فریفتہ شاعر جانتا ہے یہ سب ختم ہو جائے گا، جو لمحے نصیب

ہیں انھیں غنیمت جانو، انبساط اور جمالیاتی مسرتیں اور لذتیں حاصل کرتے رہو اس لیے کہ حسن زندگی ہو یا حسنِ محبوب سب گم ہو جائیں گے۔

مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے
حسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے

اسی بنیادی خیال کو لئے ان کی ایک اور نظم ہے ''دم غنیمت ہے''، ''عیش دنیا کو غنیمت جانو'' چھوٹی سی پیاری نظم ہے، اسے پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے اس بنیادی تجربے کو اپنے احساس اور جذبے میں تحلیل کر کے اسے نئی صورت دی ہے، اس خیال کی یہ عمدہ تخلیقی صورت ہے۔

●

دیکھ ٹک، غافل، چمن کو گل فشانی پھر کہاں — یہ بہار عیش یہ شور جوانی پھر کہاں
ساقی و مطرب، شراب اور ارغوانی پھر کہاں — عیش کر خوباں میں اے دل، شادمانی پھر کہاں
شادمانی گر ہوئی تو زندگانی پھر کہاں

یہ جو بانکے گل بدن ملتے ہیں سو سو گھات سے — کچھ مزے، کچھ لوٹ حظ، ان گل رخوں کی ذات سے
ایک دم ہرگز جدا مت ہو، تو ان کے سات سے — جس قدر پینا ہو پی لے، پانی ان کے ہات سے
آبِ جنت تو بہت ہوگا، یہ پانی پھر کہاں

یہ جو کڑوے ہو کے ہم کو اب جھڑکتے ہیں یہاں — ان کی تلخی میں ہزاروں ہیں بھری شیرینیاں
اٹھ سکے جب تک اٹھا اے دل تو ان کی سختیاں — لذتیں جنت کے میوے کی بہت ہوں گی وہاں
پر یہ میٹھی گالیاں خوباں کی کھانی پھر کہاں

رہ وہیں اے دل سدا محبوب رہتے ہیں جہاں — کر لے ان کی خدمتیں ہر دم دل و جاں سے میاں
جو تجھے دیویں سو لے لے اور غنیمت اس کو جاں — واں تو حوروں کے گہنے کے بہت ہوں کے نشاں

ان پری زادوں کے چھلوں کی نشاں پھر کہاں؟

ہو سکے جس طور سن لے دوستوں کی واردات — اور بیاں کر آ گے ان کے ہوں جو تجھ پہ مشکلات
جس گھڑی آئی قضا کوئی نہ پھر پوچھے گا بات — الفت و مہر و محبت سب ہے جیتے جی کے سات

مہرباں جب اٹھ گئے ہے مہربانی پھر کہاں

اب جو آغاز جوانی کی بہاریں ہیں میاں — عیش و عشرت میں اڑا لے زندگی کی خوبیاں
نشہ پی کر کوئی دم کر لے تو سیر بوستاں — واعظ و ناصح کہیں تو ان کے کہے کو نہ مان

دم غنیمت ہے، میاں، یہ نو جوانی پھر کہاں

ہو کے ہر دم خوب رویوں کی محبت میں اسیر — کھا نگاہِ سرمہ سا کی ناوکوں کے دل میں تیر
وصف اب ان کا جو کرنا ہے تو کر لے دل پذیر — جا پڑے چپ ہو کے جب شہر خموشاں میں نظیر

یہ غزل، یہ ریختہ، یہ شعر خوانی پھر کہاں

●

زندگی کی خوبصورتی اور عشق کے گہرے جذبے کا احساس دیتے ہوئے شاعر نے زندگی کے گزر جانے اور ہر شئے کے پگھل جانے کے تئیں بیدار کیا ہے۔ ''دم غنیمت ہے'' یہ زندگی پھر ملنے والی نہیں ہے لہٰذا ساقی مطرب، شراب ارغوانی سب کو غنیمت سمجھنا چاہئے۔ یہ بانکے گل بدن پھر نہیں ملیں گے۔ ان کے ہاتھ سے جس قدر پینا چاہتے ہو پی لو اس لیے کہ موت کے بعد آب جنت تو بہت ملے گا یہ پانی پھر نصیب نہیں ہوگا۔ اس زندگی میں محبوب کی میٹھی میٹھی گالیاں جنت کے میووں سے زیادہ لذیذ اور رس بھری ہیں، جنت میں حوروں کے گہنے تو نظر آئیں گے لیکن وہ بات کہاں ہوگی میاں جو محبوبوں کے چھلوں میں ہے۔ یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ یہ محبوب بھی دنیا سے اٹھ جائیں گے انہیں بھی رہنا نہیں ہے اور جب یہ اٹھ گئے تو ہم مہربانیاں ڈھونڈتے رہ جائیں گے۔

جمالِ زندگی پر فریفتہ اور لذتوں سے آشنا شاعر آوازوں اور آہنگ کو بھی اہمیت دیتا ہے۔ مثلاً چمک چمک، جھپک جھپک، چوں چوں، کوں کوں، ہو ہو، بھتوں بھتوں، جھپٹ جھپٹ، غٹ کے غٹ، کھڑا کے جھنا کے وغیرہ۔ ایک شعر ہے:

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں چوں چوں سب بے چوں بے چوں کرتی ہیں

یہ بھی سنئے:

جام کے لب سے ہر گھڑی، نکلے تھی مے چھلک چھلک
یار بغل میں غنچہ لب، بوسوں کی سولپک لپک
عیش وطرب کی لذتیں ہونے لگیں جو یک بہ یک
ایسے مزے میں عیش میں آہ کہیں سے یک نہ دھک

(چاندنی)

زور مزوں سے رات کو، برسے تھامینہہ جھمک جھمک
بوندیں پڑیں ٹپک ٹپک، پانی پڑے جھپک جھپک
جام رہے چھلک چھلک، شیشہ رہے بھبک بھبک
یار بغل میں بانک، عیش وطرب تھے بے دھڑک

یہ آہنگ (Rhythm) اور یہ آوازیں احساس اور جذبے دونوں کو تجربوں کے آہنگ سے بہت قریب کر دیتی ہیں، ان سے اکثر احساس میں نغمگی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ آوازیں سائیکی، کو چھونے لگتی ہیں۔

نظیر اکبر آبادی کی جمالیات کا دوسرا رنگ عشق ومحبت کے جمال کا ہے، ان کی نظمیں ''سوز فراق''، طلسم وصال'' ملاقات یار'' جوش جنوں'' خواب کا طلسم'' وغیرہ اس خاص رنگ کو نمایاں کرتی ہیں، حسن دیکھا اور فریفتہ ہو گئے۔

ہے دام بچھا اس کی زلفوں کے ہر بل میں جادو ہے نگاہوں میں اور سحر ہے کاجل میں

●

چہرہ ہے ترا نور کی تنویر کا نقشا اور مصرع قد حشر کی تفسیر کا نقشا
یاں تک ہے ترے حسن جہاں گیر کا نقشا مانی نے جو دیکھا تری تصویر کا نقشا
سب بھول گیا اپنی وہ تحریر کا نقشا
ہے نقش مرے دل میں ترے حسن کا ہر آن مر کر بھی مرے دل سے نہ جاوے گا تر ادھیان
زنہار نہ بھولوں گا تجھے، ارے نادان میں تو صفِ محشر میں بھی لوں گا تجھے پہچان
رانجھا کو نہ بھولے گا کبھی ہیر کا نقشا
کیا قول کیا پورا کہ اس کوہ پہ جا کر دن رات تراشا کیا دل بر کی وفا پر
ناچار جب آسر پہ ہوا وقت برابر فرہاد نے، تیشہ سے لہو اپنا بہا کر
شیریں کو دکھایا وہ جوئے شیر کا نقشا

●

نہیں ہوا میں یہ بو نافۂ ختن کی سی لپٹ ہے یہ تو کسی زلف پر شکن کی سی
میں ہنس کے اس لیے منہ چومتا ہوں غنچے کا کہ کچھ نشانی ہے اس میں ترے دہن کی سی
خدا کے واسطے گل کو نہ میرے ہاتھ سے لو مجھے بو آتی ہے اس میں کسی بدن کی سی

●

نظیر اکبرآبادی کی جمالیات میں ''ملاقات یار'' سے ''وصلِ یار'' تک کے تجربے ملتے ہیں، ان دونوں تجربوں کے درمیان میں جدائی، اور ''ہجر'' کے تجربے بھی المیہ لمحوں کے ساتھ موجود ہیں۔ ''ملاقاتِ یار'' سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

ادھر کو جس گھڑی، اے ہم نشیں، وہ یار آیا ہمارے دل سے گئی بے کلی، قرار آیا
اسے جو مہر سے ہے ذرہ پروری منظور تو پھر ادھر کو جھمکتا وہ مہر وار آیا

مزاج اس کا جو عاشق نواز ہے ہم دم تو راہ لولف پہ پھر وہ کرم شعار آیا
کسی نے دوڑ کے ہم سے کہا "مبارک ہو" "تمہارے پاس ہی وہ نازنین نگار آیا"
کسی نے گل کی طرح ہنس کے یوں کہا آکر "بھلا ہوا کہ تمہارا بھی گل عذار آیا
خوشی یہ بولی "تمہاری میں گرد خاطر ہوں"
ادھر سے عیش پکارا کہ میں بھی حاضر ہوں

"ملاقاتِ یار" بہار کا تجربہ ہے۔ یار کا آنا بہار کی آمد سے کم نہیں ہے۔

جہاں میں جس کو ملاقات یار کہتے ہیں
عجب بہار ہے، اسی کو بہار کہتے ہیں

ہمارے دل میں جو فرقت کی بے قراری تھی تو اس کے ہاتھ سے صورت عجب ہماری تھی
کبھی خیال رخ وزلف کا سحر تا شام کبھی تصویر مژگاں سے دل فگاری تھی
نہ دل لگے تھا کسی شغل سے کوئی ساعت نہ جاں کو جزالم ہجر ہم کناری تھی
یہ اضطراب تھا ہر دم، یہ اپنی بے تابی ہمارے حال پہ سیماب کی بھی زاری تھی
خدا کے فضل سے پھر اس میں خیر وخوبی سے وہ دن بھی آیا کہ جس کی امید داری تھی
جو دیکھی بھر کے نظر گل عذار کی صورت
تو ہر طرف نظر آئی بہار کی صورت
عیاں جو سامنے آکر وہ گل عذار ہوا تو عالم عیش کا پھر ایک سے ہزار ہوا
نگہ کو حسن نے اس گل کے تازگی بخشی خوشی قریب ہوئی، دور، انتظار ہوا
جدا جو ہجر میں ہم سے قرار رہتا تھا ہمارے دل سے وہ پھر آن کر دوچار ہوا
تسلی دل کو ہوئی اس صنم کے ملنے سے رخ اس کا دیکھتے ہی رفع اضطرار ہوا
طلب تھی دل کے تئیں جس کی ایک مدت سے ہزار شکر وہی عیش آشکار ہوا

نشاط وعیش کی خاطر سے ہم قرینی ہے
نیاز وناز ہے اور لطف ہم نشینی ہے

ہم اپنے دل کی خوشی کا بیاں کریں کیا کیا
کہ ایک لحظہ یہ ٹھہرا ہوا ہے عیش کا نقشا

کبھی ہیں دیکھتے رخسار یار کو ہنس ہنس
کبھی خوشی سے ہیں چھو لیتے اس کی زلف دوتا

کبھی ہیں یار کے چشم ونگاہ سے پیتے
خوشی سے عیش کے بھر بھر کے ساغر صہبا

کبھی ہیں اس کے تکلم سے دل کو خوش کرتے
کبھی ہیں اس کے تبسم پہ جی سے ہوتے فدا

جو دیکھتا ہے ہمیں اس طرح کی عشرت میں
تو یہ سخن وہ رہِ منصفی سے ہے کہتا

نظیرؔ تم نے جو حاصل یہ شادمانی کی
یہی بہار ہے بستانِ زندگانی کی

●

محبوب کی آمد بہار کی آمد ہے، اسے دیکھتے ہی بے قراری ختم ہو جاتی ہے، وہ آفتاب کی مانند نمودار ہوتا ہے اور ذروں میں چمک پیدا کر دیتا ہے، بلاشبہ وہ عاشق نواز ہے، اس کی مسکراہٹ میں گل کی سی مسکان ہے، اس کی آمد سے ماحول ہی تبدیل ہو جاتا ہے ہر جانب خوشیاں نظر آتی ہیں، عیش پکار کر کہتا ہے ''میں بھی حاضر ہوں!'' محبوب کے بغیر عاشق بے چین تھا، کبھی رخساروں کی یاد آتی اور کبھی سحر زلف کی یاد، کبھی تصویر مژگاں سامنے ہوتی، محبوب نہیں آتا تو اضطراب اور بڑھ جاتا، وہ آیا اور اس کے آتے ہی ہر جانب بہار آ گئی وہ خود بہار کی صورت نمودار ہوا اور اضطراب ختم ہو گیا۔ اس کے حسنِ نگر نے تازگی بخش دی اب میں خوش ہو کر کبھی اس کے رخسار دیکھ رہا ہوں اور کبھی اس کی زلفوں کو چوم رہا ہوں۔ کبھی اس کی آنکھوں کے جام سے شراب پی رہا ہوں اور کبھی اس کے تکلم سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ زندگی کی بہار تو یہی ہے۔
نظیر اکبر آبادی کا رومانی جمالیاتی ذہن حسن فطرت اور حسن محبوب میں ایک

خوبصورت وحدت پیدا کر دیتا ہے۔ محبوب چمن میں آتا ہے تو فطرت پر اس کے حسن و جمال کا اثر ہوتا ہے۔

چمن میں دن کو جو اک دو قدم وہ چلتے ہیں   تو پھول آنکھوں سے تلوے ان کے ملتے ہیں
خوشی سے غنچے بھی ہر شاخ پر اچھلتے ہیں   وہ چاندنی میں جو ٹک سیر کو نکلتے ہیں
تو مہ کے طشت میں گھی کے چراغ جلتے ہیں

●

محبوب کی ایک متحرک چنچل تصویر اس طرح ملتی ہے:

بہار دیکھی جو اس صنم کی تو وصف اس کا کہوں میں کیا کیا   پری بھی دیکھے تو شرمگیں ہو وہ حسن و خوبی بھری سرا
وہ چال چنچل، وہ نظریں جادو پیاری صورت وہ خوب نقشا   ادا وہ بانکی عجب کی وہ ترچھی چتون بھی کچھ تماشا
بھویں وہ جیسی کھنچی کمانیں پلک سناں کش نگاہ بھالا

عجب روش کا وہ شوخ گل رو کہوں میں کیا کیا کچھ اس کی خوبی   ہوا فدا میں دل اور جاں سے وہ طرز اس کی جو میں نے دیکھی
کچھ ایسا مہوش کچھ ایسا دل بر کہوں کہاں تک صفت میں اس کی   وہ آنکھیں مست اور گلابی اس کی کہ ان کو دیکھے تو دیکھی
سے محبت کا اس کے دل کو ہو گیا بھی گہرا نشہ دو بالا

وہ شوخ چنچل کچھ ایسے ڈھب کا کہ اس کا مکھڑا جو کوئی دیکھے   پھرے دوانا ہر طرف وہ اسی کی چاہت میں ہوش کھووے
لگاوٹیں بھی کئی طرح کی فریب و فن بھی کئی نما کے   لبوں پہ سرخی وہ پان کی کچھ کہ لعل بھی منفعل ہو جس سے
وہ آن ہنسنے کی بھی پھر ایسی کہ جس کا عالم ہے کچھ نرالا

●

غم فراق میں تڑپتے عاشق کی کئی تصویریں سامنے آتی ہیں۔

کوک کروں تو جگ ہنسے اور چپکے لاگے گھاؤ

اس ایک مصرع سے فراق کے درد کی کیفیت کا اندازہ ہو جاتا ہے کہتے ہیں:

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد

وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

سوزِ فراق، کا یہ شعر بھی ملاحظہ فرمایئے تجربہ ایک ہی ہے۔

اگر کچھ منہ سے بولوں تو مزا الفت کا جاتا ہے

وگر چپکا ہی رہتا ہوں کلیجا منہ کو آتا ہے

اس شعر پر غور فرمایئے برہ کی آگ کی تپش کیسی ہے:

برہ آگ تن میں لگی، جرن لگے سب گات

ناری چھووت بید کے، پڑے۔پھپھولا ہات

پوری نظم میں اضطراب اور بے چینی ہے۔ عاشق سسکتا ہے آہیں بھرتا ہے، آنسو بہاتا ہے، صبح سے شام تلک صحرا میں بھٹکتا ہے، گریباں چاک کرتا ہے، حالت کا اندازہ ان اشعار سے ہوگا:

کبھی ہوکر گریباں چاک صحرا کو نکلتا ہوں

کبھی گھبرا کے پھر گھر کی طرف ناچار چلتا ہوں

لگی ہے آگ دل میں شمع ساں جل کر پگھلتا ہوں

دھواں اٹھتا ہے آہوں کا بہ رنگِ موم گلتا ہوں

●

نظم جدائی، کے یہ اشعار بھی توجہ چاہتے ہیں:

کبھی چمن کو جو گھبرا کے ہوں نکل جاتا

تو واں بھی ہائے ذرا دل نہیں ہے ٹھہراتا

جدھر کو جاؤں ادھر غم جگر کو ہے کھاتا

عجب خرابی ہے کچھ، ہائے بن نہیں آتا

غضب ہے، قہر ہے یارو، ستم جدائی کا
خدا کسی کو نہ دکھلائے غم جدائی کا

'ہجر' کے موضوع پر ان کی نظم "فراق' بھی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ تینوں نظمیں ہجر کے درد اور جدائی کے گہرے غم احساس سے قریب کرتی ہیں۔

فراق میں عاشق کی کیفیت دیکھئے:

جب سے تم کو لے گیا ہے یہ فلک اظلم کہیں　　جی ترستا ہے کہیں اور چشم ہے پرنم کہیں
ہم پہ جو گزرا ہے وہ گزرا کسی پر کم کہیں　　نے تسلی ہے نہ دل کو چین ہے اک دم کہیں
چھوٹ جاویں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

تم وہاں بیٹھے ہو ہم یاں ہجر کے ہاتھوں خراب　　نہ تو دن کو بھوک ہے، نہ رات کو آتا ہے خواب
بے قراری، یادگاری، انتظاری اضطراب　　کیا کہیں، تم بن پڑا ہے ہم پہ اب کیسا عذاب
چھوٹ جاویں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

ہر گھڑی آنسو بہانا دیدۂ خوں بار سے　　رات دن سر کو پٹکنا ہر در و دیوار سے
آہ و نالہ کھینچنا ہر دم دل بیمار سے　　ہے برا احوال اب تو ہجر کے آزار سے
چھوٹ جاویں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

یاد آتی ہے تمہاری الفتوں کی جب کہ چاہ　　دل کے ٹکڑے ہوتے ہیں آنسو بہے ہیں خواہ مخواہ
پانوں میں طاقت، نہ تن میں زور، نہ معلوم راہ　　کیا غضب ہے، کیا کریں، کچھ بن نہیں آتی ہے آہ!
چھوٹ جاویں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

نے رفیق اپنا کوئی اور نے کوئی غم خوار ہے		نے کسی سے مہر والفت نے کسی سے پیار ہے
کیا کہیں اب تو بہت مٹی ہماری خوار ہے		دل ادھر سینے میں تڑپے جی ادھر بیمار ہے

چھوٹ جاویں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

نے خوش آوے سیر، نے سرو وسمن میں دل لگے		گھر میں جی بہلے نہ باہر انجمن میں دل لگے
اب تو تم بن نے گلستاں نے چمن میں دل لگے		نے بہاروں میں، نہ صحرا میں نہ بن میں دل لگے

چھوٹ جاویں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

جی ہی جی میں کب تلک خونِ جگر کو کھایئے		پر نہیں، اُڑ کر تمہارے پاس جو آجایئے
دل سمجھتا ہی نہیں کیوں کر اسے سمجھایئے		چشم تر اور داغ سینے کے کسے دکھلایئے

چھوٹ جاویں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

نالہ وفریاد ہیں ہر آن گھائل کی طرح		دم بہ دم بھرتے ہیں ٹھنڈی سانس بے دل کی طرح
خاک خوں میں لوٹتے ہیں اب تو بسمل کی طرح		سر پٹکنا اور تڑپنا رات دن دل کی طرح

چھوٹ جاویں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

ہجر اور فراق پر عاشق کی اندرونی کیفیتوں کو لئے اردو شاعری میں یہ پہلی بھر پور نظم ہے۔ تڑپتے بے چین عاشق کی ایسی متحرک تصویر موجود نہیں جو اپنے کینوس پر احساسات اور جذبات کے ایسے تیز اور شوخ رنگوں کو لئے ہو کہ ان پر نظر پڑتے ہی ذہن آہنگ احساس تک پہنچ جائے۔ ہجر کے لحاتی تجربوں کا بیان کلام نظیر میں رسمی نہیں ہے۔ کلام پڑھتے ہوئے درد کی پہچان ہوتی جاتی ہے۔ نظیر جس طرح نشاطیہ تجربوں

کے بڑے شاعر ہیں اسی طرح المیہ تجربوں کے بھی بڑے شاعر ہیں۔ ہجر کے تجربوں کا تعلق اس محبوب کی جدائی سے ہے جسے عاشق نے جی جان سے چاہا ہے جس کی ہر ادا پر قربان ہوا ہے۔ یہ وہ عاشق ہے کہ جس کے رومانی جمالیاتی 'وژن' نے محبوب کا ذکر اس طرح کیا تھا،

ہے دام بچھا اس کی زلفوں کے ہر اک بل میں جادو ہے نگاہوں میں اور سحر ہے کاجل میں
سر پاؤں سے شوخی ہے اس چلبلے چنچل میں چتون کی لگاوٹ نے اک آن کی چھل بل میں
پلکوں کی جھپک دکھلا دل چھل لیا اک پل میں

''شوخ بغل میں غنچہ لب، مے کے نشوں کی تازگی!'' کلام نظیر میں وصل کے لمسی تجربوں کا ذکر کر چکا ہوں۔ عشق، ہجر اور وصل سے نظیر کے کلام میں ایک دلکش جمالیاتی مثلث بنتا ہے۔

وصل کے تجربوں کے تعلق سے یہ اشعار بھی یاد کیجئے:

جب یار چلا اوڑھ کے کالا سا دوشالا
کمبل کو ادھر ہم نے بھی کاندھے پہ سنبھالا
جا مل گئے اور دل کا بھی ارمان نکالا
منھ اس کے رقیبوں کا کیا خوب سا کالا
کیا وصل کی رکھتی ہے کرامات اندھیری
کام آتی ہے عاشق کے بہت رات اندھیری

کل یار نے اور ہم نے جو پی مے کی کلابی
اور عیش لگے کرنے جو ہو ہو کے شرابی
اتنے میں رقیب آ گیا، بو سونگھ شتابی
گر چاندنی ہوتی تو بڑی ہوتی خرابی

ٹالے ہے سب آئی ہوئی آفات اندھیری
کام آتی ہے عاشق کے بہت رات اندھیری
سوتے تھے جو ہم اس میں سنے غیر کے کھٹکے
چھپ چھپ گئے اٹھ دونوں وہیں نیچے پلنگ کے
ہم ہنستے رہے اس نے ڈھبک ڈھوئے جو مارے
کتنا ہی ٹٹولا جو اجالا ہو تو پاوے
چوری کی بھی رکھ لیتی ہے کیا بات اندھیری
کام آتی ہے عاشق کے بہت رات اندھیری

کلام نظیر میں تیسرے رنگ کا یعنی معاشرے اور سماج کے جمال کا وہ رنگ کہ جس کا تعلق روایات سے گہرا ہے، ذکر کیا جا چکا ہے۔

جشن زندگی کے اس بڑے شاعر نے زندگی کے جلال و جمال سے جو گہرا رشتہ رکھا ہے اور فطرت کے آہنگ کا جو احساس بخشا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، یہ نظیر کے کلام کا پہلا رنگ قرار دیا جا سکتا ہے دوسرا رنگ عشق و محبت کے جمال کا رنگ ہے کہ جس میں نشاطیہ آہنگ بھی ہے اور المیہ آہنگ بھی، یہ پہلو بھی جمالیات نظیر کا ایک دلکش پرکشش پہلو ہے۔ چوتھا رنگ مذہب اور تصوف کا ہے۔ اس رنگ میں بھی شاعر کی جمالیاتی بصیرت کی پہچان ہوتی ہے۔ محسوسات کے ساتھ رفعتِ تخیل اور سرمستی سے بھی قاری کا ذہن متاثر ہوتا ہے۔

نظیر کی جمالیات کی ایک بڑی سطح تصوف اور حکیمانہ نقطۂ نظر کی ہے۔ درویشانہ اور فقیرانہ زندگی کا جمال سامنے آتا ہے ساتھ ہی حزنیہ آہنگ (Pathetic Rhythm) بھی موجود ہے۔

بنیادی موضوعات یہ ہیں:

- دم غنیمت ہے ......دیکھ ٹک غافل، چمن کو گل فشانی پھر کہاں!
- حسن و جمال کو غنیمت سمجھو ......حسن یہ دو دن کا ہے مہمان، ہنس لے بول لے!
- رہے نام اللہ کا ......دنیا میں کوئی خاص نہ کوئی عام رہے گا!
- دنیا کے تماشے ......کھول ٹک چشم تماشا، یار باشے پھر کہاں!
- تو پھر کیا؟ ......دارا، جم وسکندر، اکبر ہوا، تو پھر کیا؟
- سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا ......جب لاد چلے گا بنجارا!
- صدا ......اب موت نقارہ باج چکا، چلنے کی فکر کرو بابا!
- دھوکے کی ٹٹی ......ہم دیکھ چکے اس دنیا کو، یہ دھوکے کی سی ٹٹی ہے!
- موت ......جیتا رہا نہ کوئی، ہر اک آ کے مر گیا!
- فنا ......انسان نرا خاک کا پتلا ہے۔ آخر خاک ہی میں اس کو مل جانا ہے!
- خدا کی باتیں ......خدا ہی جانے!

تصوف اور اس کی جمالیات سے نظیر کی دلچسپی نے ان موضوعات کو جاذب نظر بنا دیا ہے۔

صوفی کا جمالیاتی شعور کل سے اپنے وجود کے آہنگ کا رشتہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ تصوف کی جمالیات سے تخلیقی فنکار کا ذہن مرتب ہوتا ہے تو فنکار کے احساسِ جمال میں اور تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ تصوف کی جمالیات سے رشتہ قائم ہوتے ہی زندگی کو دیکھنے کا ایک ٹھوس مثبت رویہ پیدا ہو جاتا ہے، انسان اور انسان کی محبت کا جذبہ شدت سے بیدار ہو جاتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی صوفی نہیں ہیں لیکن ایک صوفیانہ جمالیاتی شعور کے مالک ضرور ہیں۔ ان کی انسان دوستی اور ان کی خوش دلی اور شگفتہ مزاجی اسی کی دین ہے۔ انہیں انسان اور مالک کی خلق کی ہوئی زندگی سے محبت ہے،

زندگی کی ٹریجیڈی اور موت سے بے خبر نہیں ہیں خوب جانتے ہیں کہ یہ خوبصورت زندگی اور زندگی کا سارا جلال و جمال ختم ہو جائے گا لیکن اس کے باوجود انسان کے باطن کی خوبصورتی اور وجود انسانی کی خوشبو دیکھ پا کر متوالے رہتے ہیں۔ سماجی زندگی کی برائیوں سے بھی خوب واقف ہیں لیکن اپنے مثبت رویے سے ان کے احساس کو ہر ممکن کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا صوفیانہ جمالیاتی شعور درد سے آشنا کرتا رہتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کی لذت سے بھی واقف کرا دیتا ہے۔ کل سے اپنے وجود کے آہنگ کا رشتہ قائم کرنے والا ہی مذہب کی سچائی کو سمجھ سکتا ہے، مذہب کے تعلق سے نظیر اکبر آبادی کے تصورات اس حقیقت کو واضح کر دیتے ہیں۔

نظیر ایک کھلے ہوئے ذہن کے مالک ہیں، دوسروں کے عقائد اور خیالات میں محبت اور عقیدت اور انسان دوستی کے جذبے کو پا کر خوش ہوتے رہتے ہیں، کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ انسان کی تمام میراث کو اپنا سمجھتے ہیں، اس بات کی طرف توجہ نہیں دیتے کہ عقائد کس کے ہیں خیالات کس کے ہیں، کرشن اور ان کی بنسری اپنی ہے، ہندوستانی اسطور اور اسطوری کردار اپنے ہیں، تمام تہوار اپنے ہیں، پرانے کھیل تماشے اور جشن اپنے ہیں، تاج محل اپنا ہے بلدیو جی کا میلہ اپنا ہے، حضرت سلیم چشتیؒ اپنے ہیں بابا گرونانک اپنے ہیں، ساری خوبصورت متحرک روایات اپنی ہیں، ہم سب ایک بڑی میراث کے مالک ہیں، مختلف رنگوں کی تہذیبی، تمدنی اور فکری اور مذہبی میراث قوسِ قزح کے خوبصورت رنگوں کی طرح ہے جو ایک دلکش جمالیاتی وحدت کا ایک گہرا احساس بخشتی ہے انسان محسوس کرے یا نہ کرے وہ خود اپنی میراث کی مانند قوسِ قزح بن گیا ہے۔ تہذیبی اور تمدنی جمالیاتی وحدت کی قوس قزح نے انسان کو اور انسان کی فکر و نظر اور تفکر کی قوس قزح سے تہذیب اور تمدن کی قوس قزح کو سمجھا جا سکتا ہے۔ غور کیجیے تو محسوس ہوگا کہ کلام نظیر

کے پیچھے ایک دانشور چھپا بیٹھا ہے۔ جس کا ایک بڑا کام یہ بھی ہے کہ وہ خام توانائی (Crude energy) کی صورت تبدیل کرتا ہے اسے زیادہ سے زیادہ ری فائین (Refine) کرتا ہے۔

نظیر اکبرآبادی جس صوفیانہ مزاج کے مالک ہیں اور تصوف کی جمالیات کی جس سطح سے وابستہ میں اس کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ وہ زندگی اور معاشرے کی پوری قوسِ قزح میں جیتے رہے ہیں، ذرّے سے خالق کائنات تک جو قوس قزح ہے اس کے اندر شاعر کا جمالیاتی شعور کام کرتا ہوا نظر آتا۔ کلام نظیر میں انسان اور اس کی زندگی سے جو بے پناہ محبت ملتی ہے اس کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ جو حضرات نظیر کے ڈکشن، پر اعتراض کرتے ہیں انہیں سوچنا چاہئے کہ یہ اس اردو کا ڈکشن ہے جو ان کے دور میں مختلف بولیوں اور مقامی زبانوں کے رنگ و آہنگ سے متاثر تھی، اس کا ثبوت نظیر کے کلام کے مختلف آہنگ اور حرکت سے صاف طور پر مل جاتا ہے۔ آزاد دانشورانہ شعور نے بیان کی آزادی کو پسند کیا ہے، لفظوں اور ترکیبوں کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہیروں کی طرح ان کی صفائی کا سلسلہ نظیر کے بہت بعد تک قائم رہا ہے۔ انگریزی ادب میں لفظوں اور ترکیبوں کے پیش نظر جوشر کا معاملہ بھی کچھ اسی نوعیت کا ہے۔ اس کے یہاں جانے کتنے الفاظ ہیں جو ہیروں کی مانند صاف نہیں ہوئے تھے لیکن تھے ہیرے ہی۔

پیبلو پکاسو (Pablo Picasso) کے پاس ایک شخص آیا گزارش کی میرا 'پورٹریٹ' بنادیجئے جو مانگیں گے پیش کروں گا پورٹریٹ، تیار ہوگیا وہ شخص آیا، کینوس پر نظر ڈال کر کہا " مجھے پسند نہیں آیا " پکاسو اندر گیا وہاں سے کچھ رنگ لایا اور ایک بڑا کینوس، کہا " آپ اس پر اپنا پورٹریٹ خود بنا لیجئے " میں کینوس بھی دے رہا ہوں اور رنگ بھی "۔

1:

وہ شخص کچھ گھبرا گیا ایک بار پھر اس کینوس، پر نظر ڈالی کہ جس پر اس کا پورٹریٹ بنا تھا، دیکھتے دیکھتے اچانک اسے سچائی کا علم ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ صرف رنگوں کا معاملہ نہیں ہے صرف کینوس، اور برش، کا بھی معاملہ نہیں ہے اس کے پیچھے مصور چھپا بیٹھا ہے جس نے لکیروں رنگوں اور 'کینوس' کو یکجا کر کے ایک نئی وحدت پیدا کردی ہے، اس سے تو نغماتی لہریں اٹھ رہی ہیں، اس میں تو ایک حیرت انگیز موزونیت، یا ہارمونی، (harmony) ہے۔ اس شخص کے اندر بھی ایک فنکار چھپا ہوا تھا جو اچانک جاگ پڑا۔

نظیر کے کلام میں کینوس، رنگ اور لکیروں کو الگ الگ دیکھنے سے سچائی کی پہچان نہیں ہوگی۔

نظیر کے کلام کے اندر جھانکتے جایئے محسوس ہوتا جائے گا کہ انسان اور اس کی زندگی سے ان کا عشق عشق سے آگے ایک حیرت انگیز عبادت بھی ہے۔

تخلیقی ذہن پر تصوف کی جمالیات کا جو اثر ہوا اس سے شاعر کے جمالیاتی 'وژن' میں بڑی کشادگی پیدا ہوگئی، اس کی بصیرت شدت سے متاثر کرنے لگی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم ''آئینہ'' پیش کرنا چاہتا ہوں جو اردو کی خوبصورت نظموں میں ایک نظم ہے، ایسے تجربوں کا ایک انتہائی دلکش دیباچہ یا پیش لفظ ہے۔

☆☆☆

آئینہ

(من عرف نفسہ فقط عرف ربّہ)

لے آئینے کو ہاتھ میں، اور بار بار دیکھ — صورت میں اپنی قدرت پروردگار دیکھ
خال سیاہ اور خطِ مشک بار دیکھ — زلفِ دراز طرۂ عنبر نثار دیکھ

ہر لحظہ اپنی چشم کے، نقش ونگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

آئینہ کیا ہے؟ جان، ترا پاک صاف دل   اور خال کیا ہیں؟ تیرے سویدائے رخ کے حل
زلف دراز، منہم رسا سے طرح ہے مل   لاکھوں طرح کے رنج ہی میں ہم رہے ہیں کھل

ہر لحظہ اپنی چشم کے، نقش ونگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

مشک تتار ومشک ختن بھی تجھی میں ہے   یا قوت سرخ ولعل یمن بھی تجھی میں ہے
نسرین وموتیا وسمن بھی تجھی میں ہے   القصہ کیا کہوں میں، چمن بھی تجھی میں ہے

ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش ونگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

سورج مکھی کے گل کی اگر دل میں تاب ہے   تو اپنے منہ کو دیکھ کہ خود آفتاب ہے
گل اور گلاب کا بھی تجھی میں حساب ہے   رخسار تیرا گل ہے پسینا گلاب ہے

ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش ونگار دیکھ
اے گل، تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

نرگس کے پھول پر، تو نہ اپنا گمان کر   اور سرو سے بھی دل نہ لگا اپنا جان کر
اپنے سوا کسی پہ، نہ ہرگز تو دھیان کر   یہ سب ہمارے ہیں تجھی میں تو آن کر

ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش ونگار دیکھ
اے گل، تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

نرگس وہ کیا ہے؟ جان، تری چشم خوش نگاہ   اور سرو کیا ہے؟ یہ ترا قد دراز، آہ
گر سیر باغ چاہئے، تو اپنی ہی کر تو چاہ   حق نے تجھی کو باغ بنایا ہے، واہ واہ

ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش ونگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

گر دل میں تیرے قمری و بلبل کا دھیان ہے — تو ہونٹھ تیرے قمری ہیں، بلبل زبان ہے
ہے تو ہی باغ اور، تو ہی باغبان ہے — باغ وچمن میں جتنے تو ان سب کی جان ہے
ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش ونگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

بیلا، گلاب، سیوتی، نسرین ونسترن — داؤدی، جوہی، لالہ ورابیل، یا سمن
جتنی جہاں میں پھولی ہیں پھولوں کی انجمن — یہ سب تجھی میں پھول رہی ہیں چمن چمن
ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش ونگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

باغ وچمن کے غنچہ، وگل میں نہ ہوا سیر — قمری کی سن صفیر، نہ بلبل کی سن صفیر
اپنے تئیں تو دیکھ، کہ کیا ہے تو اے نظیر — ہیں حرف "من عرف" کے یہی معنی، اے نظیر
ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش ونگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

●

یہ خوبصورت نظم انسان کے وجود کی اہمیت کا احساس بڑی شدت سے بخشتی ہے۔ تمام روشنیوں، تمام خوشبوؤں تمام رنگوں اور تمام آوازوں کی وحدت انسان کے وجود کے اندر ہے، انسان کائنات کے تمام حسن و جمال کی علامت ہے شاعر نے مختلف استعاروں اور علامتوں سے اس جمالیاتی وحدت کا احساس بخشا ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے انسان کو الوہی نغمہ (Divine melody) بنادیا ہے۔ نظم کے استعاروں اور علامتوں پر نظر رکھیں تو محسوس ہوگا کہ انسان ایک ایسی قوس وقزح ہے جو زندگی کے تمام رنگوں کا جمال لئے ہوئے ہے۔ اس نظم کی جمالیات پر غور کریں تو اس سچائی کا علم ہوگا کہ شاعر حسیاتی انبساط (Sensory Pleasures) پا کر جھوم جھوم کر گنگنا رہا

ہے ایک سحر انگیز وجد آفریں کیفیت طاری ہے۔ اسی کیفیت کی وجہ سے اس نے انسان کے باطن میں الوہی نغمہ یا میلوڈی، کو پایا ہے۔ کسی نے کہا تھا انسان اور اس کا مذہب دونوں فطرت کے حسن میں بستے ہیں اور فطرت کا حسن انسان اور اس کے مذہب میں ہر دم موجود رہتا ہے۔ جس نے خود کو پہچانا اس نے جمالِ کائنات کو پہچانا اور اس طرح اس نے خالق کائنات کو پہچانا۔ نظیر کہتے ہیں ''اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ!'' اس بات کو انہوں نے بار بار مختلف انداز سے مختلف اشاروں، استعاروں اور علامتوں سے سمجھایا ہے۔ کہتے ہیں انسان کے وجود کے اندر ہی وہ گلستان ہے کہ جو تمام روشنیوں، تمام خوشبوؤں اور تمام رنگوں کو لئے ہوئے ہے۔ مشک تتار و مشک ختن، یاقوتِ سرخ اور لعل یمن، نسرین و موتیا دمن، سورج مکھی اور آفتاب، گل و گلاب، نرگس، سرو، قمری و بلبل، بیلا، سیوتی، نسرین، یاسمن، قمری اور بلبل سب اسی وجود میں ہیں۔

مشک، تتار و مشک ختن بھی تجھی میں ہے
یاقوت سرخ و لعلِ یمن بھی تجھی میں ہے
نسرین و موتیا دمن بھی تجھی میں ہے
القصہ کیا کہوں میں، چمن بھی تجھی میں ہے

ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

یہ کہہ کر نظیر نے سب کچھ کہہ دیا ہے۔ آخر میں کہتے ہیں:

اپنے تئیں تو دیکھ، کہ کیا ہے تو اے نظیر
ہیں حرف ''من عرف'' کے یہی معنی اے نظیر!

شاعر نے انسان کے وجود کے چمن اور روشنیوں، رنگوں اور خوشبوؤں کو ایک

جمالیاتی وحدت کی صورت پیش کر دیا ہے، ایسی جمالیاتی بصیرت کی کوئی اور مثال اردو شاعری میں نہیں ملتی۔ خیال کی وسعت اور زرخیزی اور دلکشی کے مسرت بخش آہنگ کو لئے یہ نظم ایک ممتاز درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ جمالیاتی صوفیانہ ذہن کی یہ تخلیق معنوی اعتبار سے بسیط ہے، مجھے لاؤسے (Lao-tzu) کی یہ بات یاد آ رہی ہے:

" All The Creations of This World Come From Real Inner Self of Man"

جمالیاتی صوفیانہ شعور نے انسان کے وجود کے حسن کے ساتھ خالق کائنات کے جلال و جمال کو بھی حد درجہ محسوس بنانے کی کوشش کی ہے۔ عشق الٰہی سب سے خوبصورت تجربہ ہے۔ نظیرا کبرآبادی ایک صوفی کی نظر رکھتے ہیں اور ایک پھیلے ہوئے جمالیاتی شعور کے مالک ہیں۔ اللہ کے حسن و جمال کو ہر شئے میں پہچانتے ہیں نیز یہ بھی کہتے ہیں کہ زندگی میں ہر عمل کے تحرک کا مرکز اللہ کی ذات ہے۔ 'توحید' (خدا کی خدائی) کے دو بند ملاحظہ فرمایئے:

تنہا نہ اسے اپنے دل تنگ میں پہچان — ہر باغ میں، ہر دشت میں، ہر سنگ میں پہچان
بے رنگ میں با رنگ میں نیرنگ میں پہچان — منزل میں، مقامات میں، فرسنگ میں پہچان
نت روم میں اور ہند میں اور زنگ میں پہچان — ہر راہ میں، ہر ساتھ میں، ہر سنگ میں پہچان
ہر عزم ارادے میں ہر آہنگ میں پہچان — ہر دھوم میں، ہر صلح میں، ہر جنگ میں پہچان
ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

پھل پات، کہیں شاخ کہیں پھول، کہیں بیل — نرگس، کہیں سوسن، کہیں بیلا کہیں رابیل
آزاد کوئی سب سے، کسی کا ہے کہیں میل — ملتا ہے کوئی راکھ، چنبیلی کا کوئی تیل
کرتا ہے کوئی ظلم کو لیتا ہے کوئی جھیل — باندھے کہیں تلوار، اٹھاتا ہے کوئی سیل
ادنیٰ کوئی اعلیٰ کوئی سوکھا، کوئی ڈنڈ پیل — جب غور سے دیکھا تو اسی کے ہیں یہ سب کھیل

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

"تارے کہیں سورج کہیں برج اور کہیں دن رات، جب غور سے دیکھا تو اسی کے ہیں طلسمات" اور صوفی کوئی زاہد کوئی بدمست شرابی......اور

کیا حسن کہیں پایا ہے، اللہ ہی اللہ   کیا عشق کہیں چھایا ہے اللہ ہی اللہ
کیا رنگ یہ رنگوایا ہے اللہ ہی اللہ   کیا نور یہ جھمکایا ہے اللہ ہی اللہ
کیا دھوپ ہے کیا سایہ ہے اللہ ہی اللہ   کیا مہر ہے کیا مایا ہے، اللہ ہی اللہ
کیا ٹھاٹھ یہ ٹھہرایا ہے اللہ ہی اللہ   کیا بھید، نظیر آیا ہے، اللہ ہی اللہ

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

اپنے خاص انداز اور اپنے منفرد دکشن میں عشق الٰہی اور اللہ کے جلال و جمال کو قاری کے احساس اور جذبے سے قریب کر دیا ہے۔

نظیر اکبر آبادی کی جمالیاتی صوفیانہ جہت کی شاعری میں ایک سوچنے والا (دانشور) درویش ملتا ہے، ایک مست فقیر ایک قلندر، انسان، خالق کائنات اور زندگی کے رموز واسرار کو بہت حد تک سمجھنے والا تخلیقی فنکار! درویشوں کی طرح آوازیں لگاتا ہے اور انسان اور زندگی کے تعلق سے کچھ نہ کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ درویشانہ تجربوں کے ارتعاشات (Vibrations) کے مثبت اثرات ہوتے ہیں۔ تجربوں کے مثبت ارتعاشات (Positive Vibrations) کی شعاعیں قاری کو متاثر کرتی ہیں، اس سلسلے میں نظیر کی مندرجہ ذیل نظمیں توجہ چاہتی ہیں۔

'تسلیم و رضا' (ہر حال میں خوش رہنا کمال فقر ہے) دم غنیمت ہے، (عیش دنیا کو غنیمت سمجھ) چڑیوں کی تسبیح، "دنیا دار المکافات ہے" (دو نظمیں) دنیا بھی کیا تماشا

ہے'' '' خدا کی باتیں خدا ہی جانے'' ۔ '' توکل'' '' تنبیہ الغافلین'' خدا کی دی ہوئی نعمتیں'' '' فنا'' (انسان نرا خاک کا پتلا ہے، آخر خاک ہی میں اس کو مل جانا ہے) 'فنا' (موت کے آگے علم وفضل سب ہیچ ہے)

یہ تمام نظمیں مثبت ارتعاشات کی شعاعیں ڈالتی ہیں۔ نظیر ان بڑے شاعروں میں ہیں جو اپنے احساسات اور جذبات کو منتقل کرتے ہوئے ان کے ارتعاشات کی شعاعوں کو طاری کر دیتے ہیں، بعض نظموں میں Bio electric wave s کی سی کیفیت ملتی ہے۔ نظم بہار قاری کو کھینچے لئے جاتی ہے۔ ایک چوکنا اور باشعور فنکار ہی ایسے مثبت ارتعاشات اور ان کی شعاعوں کا خالق ہوسکتا ہے۔ اردو نظم میں محمد اقبال سے قبل صرف نظیر اکبر آبادی ہی ایسے شاعر ہیں جو اپنے خیالات سے ایسے ارتعاشات پیدا کرتے ہیں جن میں Hypnotise کرنے کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ بعض نظموں کو پڑھتے ہوئے جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس میں یہی محسوس ہوتا ہے جیسے نئی باتیں کہی جارہی ہیں، لفظوں اور ان کی آوازوں سے کچھ ہوتا جارہا ہے۔ نظیر ہر حال میں خوش رہنا کمال فقر تصور کرتے ہیں، '' تسلیم ورضا'' کے بند ملاحظہ فرمائیے۔

جو فقر میں پورے ہیں وہ ہر حال میں خوش ہیں — ہر کام میں ہر دام میں ہر جال میں خوش ہیں
گر مال دیا یار نے تو مال میں خوش ہیں — بے زر جو کیا، تو اسی احوال میں خوش ہیں
افلاس میں ادبار میں اقبال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

چہرے پہ ملامت، نہ جگر میں اثر غم — ماتھے پہ کہیں چین، نہ ابرو میں کہیں خم
شکوہ نہ زباں پر، نہ کبھی چشم ہوئی نم — غم میں بھی وہی عیش، الم میں بھی وہی دم
ہر بات، ہر اوقات، ہر افعال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد، جو ہر حال میں خوش ہیں

جینے کا نہ اندوہ نہ مرنے کا ذرا غم ۔ یکساں ہے انہیں زندگی وموت کا عالم
واقف نہ برس سے نہ مہینے سے وہ ایک دم نے شب کی مصیبت نہ کبھی روز کا ماتم

دن رات گھڑی، مہرمہ وسال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد، جو ہر حال میں خوش ہیں

''تنبیہ الغافلین''میں کہتے ہیں۔

نہ یہ چہلیں، نہ دھومیں، نہ یہ چرچے بہم ہوں گے
میاں اک دن وہ آوے گا، نہ تم ہو گے نہ ہم ہوں گے

فقیروں کی صدا میں کہتے ہیں:

سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھروبابا
اب موت نقارہ باج چکا، چلنے کی فکر کرو بابا!

اور پھر ع۔سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

● نظیر اکبر آبادی غزل کی رومانیت کے بھی ایک منفرد شاعر ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار اردو غزل میں اضافہ ہیں:

چمن میں اس گل رنگیں کی جامہ زیبی نے
ہر ایک گل کے گریباں کو تار تار کیا

●

طور پر جیسے کسی وقت میں چمکی تھی چمک
کچھ سرِ بام سے ویسا ہی اجالا نکلا

●

عیسیٰ کی قم سے حکم نہیں کم فقیر کا
ارنی پکارتا ہے سدا دم فقیر کا

●

خوبی بھری ہے جس میں دو عالم کی کوٹ کوٹ
اللہ نے کیا ہے وہ عالم فقیر کا

●

سب جھوٹ ہے کہ تم کو ہمارا ہو غم میاں
بابا کسے خدا کے سوا غم فقیر کا

●

ہم کیوں نہ اپنے آپ کو رو لیویں جیتے جی
اے دوست کون پھر کرے ماتم فقیر کا

●

جب جیتے جی کسی نے نہ پوچھا تو مہرباں
پھر بعد مرگ کس کو رہا غم فقیر کا

●

پنجۂ خورشید رنگیں خون حسرت سے ہوا
برق ساں چمکا جو رنگ اس کے حنائی
دست کا

●

کیا غلط فہمی ہے صد حیف کہ مرتے دم تک
جس کو ہم سمجھتے تھے قاتل وہ مسیحا نکلا

●

اس کے شرارِ حسن نے شعلہ جو اک دکھا دیا
طور کو سر سے پاؤں تک پھونک دیا جلا دیا

●

پھر کے نگاہ چار سو ٹھہری اسی کے روبرو
اس نے تو میری چشم کو قبلہ نما بنا دیا

●

تیشے کی کیا مجال تھی یہ جو تراشے بیستوں
تھا وہ تمام دل کا زور جس نے پہاڑ ڈھا دیا

●

اگر اس گل بدن کا دل میں کچھ آزار ہو پیدا
تو پھر اپنے ہی سینے میں عجب گلزار ہو پیدا

●

چوٹی کی گندھاوٹ کہیں دکھلاتی ہے لہریں
رکھتی ہے کہیں زلف پریشان تماشا

●

یہ غنچہ جو بے درد گل چین نے توڑا
خدا جانے کس کا یہ نقشِ دہن تھا

●

تنِ مردہ کو کیا تکلف سے رکھنا
گیا وہ تو جس سے مزین یہ تن تھا
(ق)

کئی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جن کا
مشبن بدن تھا معطر کفن تھا
جو قبر کہن ان کی اکھڑی تو دیکھا
نہ عضو بدن تھا نہ تارِ کفن تھا
نظیر آگے ہم کو ہوس تھی کفن کی
جو سوچا تو ناحق کا دیوانہ پن تھا

●

صحرا میں جھمک سے آیا نظر اک نگار رعنا
کہ خود اس کے حسن رخ کو لگا تکنے ذرہ آسا
وہ مجھ کو دیکھ کچھ اس ڈھب سے شرم سار ہوا
کہ میں حیا ہی پہ اس کی فقط نثار ہوا

●

کہتے ہیں یاں کہ تجھ سا کوئی مہ جبیں نہیں
پیارے جو ہم سے پوچھو تو یہاں کیا کہیں نہیں

●

تجھ سا تو کوئی حسن میں یاں نازنیں نہیں
یوں نازنیں بہت ہیں پہ ناز آفریں نہیں

●

جب اس نہیں کے کہنے سے مانے ہے وہ برا
آپ ہی پھر اس کو کہتا ہوں ہنس کر نہیں نہیں

گر ہم نشے میں بوسہ کبھی دو تو لطف سے
تم پاس منھ کو لا کے یہ ہنس کر کہو کہ لو

●

کچھ قمریوں کے نغمے کو دو سائیں راہ تم
کچھ بلبلوں کا زمزمہ دل کشا سنو

●

نہ سرخی غنچۂ گل میں ترے دہن کی سی
نہ یاسمن میں صفائی ترے بدن کی سی
میں کیوں نہ پھولوں کہ اس گل بدن کے آنے سے
بہار آج مرے گھر میں ہے چمن کی سی
یہ برق ابر میں دیکھے سے یاد آتی ہے
جھلک کسی کے ڈوپٹے میں نور تن کی سی
گلوں کے رنگ کو کیا دیکھتے ہو اے خوباں
یہ رنگتیں ہیں تمہارے ہی پیرہن کی سی
جو دل تھا وصل میں آباد تیرے ہجر میں آہ
بنی ہے شکل اب اس کی اجاڑ پن کی سی
تو اپنے تن کو نہ دے نسترن اب تشبیہ
بھلا تو دیکھ یہ نرمی ہے تیرے تن کی سی
ترا جو پانوں کا تلوا ہے نرم مخمل سا
صفائی اس میں ہے کہیے تو نسترن کی سی

●

نہیں ہوا میں یہ بو نافہ ختن کی سی
لپٹ ہے یہ تو کسی زلف پر شکن کی سی
میں ہنس کے اس لیے منھ چومتا ہوں غنچے کا
کہ کچھ نشانی ہے اس میں ترے دہن کی سی
خدا کے واسطے گل کو نہ میرے ہاتھ سے لو
مجھے بو آتی ہے اس میں کسی بدن کی سی
ہزار تن کے چلیں بانکے خوب رو لیکن
کسی میں آن نہیں تیرے بانکپن کی سی
مجھے تو اس پہ نہایت ہی رشک آتا ہے
کہ جس کے ہاتھ نے پوشاک تیرے تن کی سی

●

دیکھ کر کرتی گلے میں سبز دھانی آپ کی
دھان کے بھی کھیت نے اب آن مانی آپ کی

●

جلوہ گر محفل میں رات اس حسن کے شعلے میں دیکھ
شمع داں شمعوں نے اپنے سب پگھل کر بھر دیئے
کل جو ٹک رویا کسی کو یاد کر وہ گل بدن
اشک تھے آنکھوں میں یا موتی پگھل کر بھر دیئے

●

جشن زندگی کا شاعر اپنی غزلوں میں بھی اپنی قلندرانہ شان رکھتا ہے۔ نظیر کا محبوب حسن و جمال کا پیکر ہے، چمن میں آتا ہے تو اس کی جامہ زیبی کا اثر یہ ہوتا ہے کہ

ہر گل اپنا گریباں تار تار کر لیتا ہے۔ اردو غزل کی روایت کے سفر میں حسن و جمال کا ایسا ہی پیکر میر اور غالب کے کلام میں ملتا ہے۔

نظیر کی غزلوں میں دو پیکروں کی محبت اپنی سرشاری اور رومانیت سے متاثر تو کرتی ہی ہے ساتھ ہی عشق کا ایسا تصور بھی سامنے آجاتا ہے جو عشق الٰہی اور عشق درویش کی اندرونی کیفیت اور اس کے ردِعمل کو نمایاں اور ظاہر کرتا ہے۔ ان کی غزلوں میں محبوب گوشت پوست کا پیکر بھی ہے اور ذات الٰہی بھی۔ شرارِ حسن کے شعلے سے طور جل کر خاک ہو جاتا ہے اور گل بدن کے دل میں تھوڑی سی ہمدردی عاشق کے اندر ایک گلزار پیدا کر دیتی ہے۔ نظیر کے ذہن میں کشادگی پیدا ہوتی ہے تو خورشید، آفتاب، صبح، گلزار، تیشہ، پہاڑ، برق وغیرہ کے استعارے بڑے پرکشش بن جاتے ہیں۔ محبوب کے جمال کا ذکر آتا ہے تو چوٹی کی گندھاوٹ، زلفِ پریشاں، غنچہ دہن، رنگ گل، بوسے کا نشہ، زلفِ پرشکن، وغیرہ سے اس پیکر کی تصویر بنائی جاتی ہے۔ تن کی صفائی، تن کی نرمی، مخمل سا پانوں کا تلوا، سبز دھانی کرتی وغیرہ اردو غزل میں پہلی بار جلوہ بنتے ہیں۔ ایسے اشعار بلاشبہ اردو غزل میں اضافہ ہیں۔

خدا کے واسطے گل کو نہ میرے ہاتھ سے لو
مجھے بو آتی ہے اس میں کسی بدن کی سی

مجھے تو اس پہ نہایت ہی رشک آتا ہے
کہ جس کے ہاتھ نے پوشاک تیرے تن کی سی

دیکھ کر کرتی گلے میں سبز دھانی آپ کی
دھان کے بھی کھیت نے اب آن مانی آپ کی

اس رنگین خوش نوائی اور متوازن شعریت کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ نظیر اکبرآبادی غزل میں بھی ذہن اور تخیل کو اکساتے ہیں اور جمالیاتی آسودگی بخشتے ہیں!

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ و اساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

کلیات اکبرالہ آبادی جلد اول

مرتب

احمد محفوظ

صفحات : 694

قیمت : -/370 روپے

کُلّیاتِ سراج

مصنف

سراج اورنگ آبادی

صفحات : 736

قیمت : -/138 روپے

کُلّیاتِ فانی

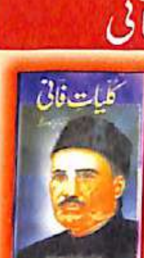

مُرتّبہ

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

صفحات : 318

قیمت : -/63 روپے

کُلّیاتِ محمد قلی قطب شاہ

مُرتّبہ

ڈاکٹر سیدّہ جعفر

صفحات : 824

قیمت : -/157 روپے

کُلّیاتِ ذوق (اردو)

مُرتّبہ

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

صفحات : 496

قیمت : -/93 روپے

کُلّیاتِ عیش

مُرتّبہ

ڈاکٹر حبیبہ بانو

صفحات : 556

قیمت : -/80 روپے

क़ौमी काउन्सिल बराए फरोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110066